

MISC

روحِ تہذیب

مقالہ

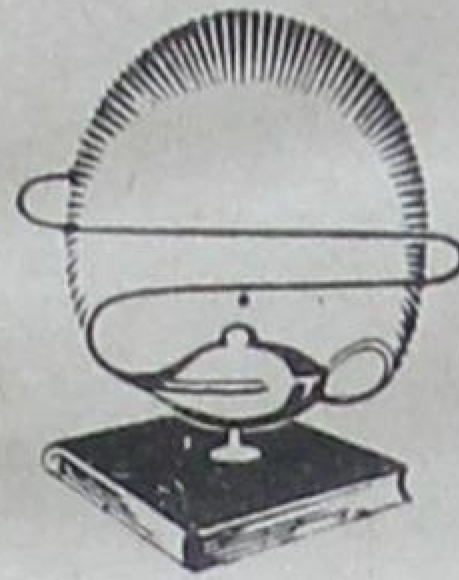
اُردُو اکادمی جامعہ ملّیہ اسلامیہ

مئی ۱۹۳۲ء

خواجہ غلام السیّدین

مکتبہ جامعہ نئی دھلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

ROOH-E-TAHZEEB
K. G. SAIYIDAIN



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی 110025 ، اُردو بازار، دہلی 110006
پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003 ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

تیسری بار: جون ۱۹۸۱ء تعداد 1000 قیمت : 4/50

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

اِنتساب

میں ان اوراق کو اپنی والدہ مرحومہ کے اسم گرامی سے معنون کرتا ہوں، جن کی ذات میں میں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ واضح طور پر ان صفات کا جلوہ دیکھا جن پر تہذیبِ نفس کا دار و مدار ہے اور جن کی مثال سے مجھ پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ انسانی زندگی محض خود غرضی اور نفس پرستی کی مجنونانہ جد و جہد کا نام نہیں بلکہ اس سے بدرجہا ارفع و اعلا چیز ہے۔

غلام السیّدین

دیباچہ

جناب خواجہ غلام السیدین صاحب ہندستان کے ممتاز ماہر تعلیم ہیں اور اس ملک میں جہاں اب تک تعلیم کا کام محض ایک دفتری اور انتظامی کام سمجھا جاتا ہے یہ بدعت رائج کرنا چاہتے ہیں کہ عملی تعلیم کی بنا نظری غور و فکر اور اصولی تحقیق و تدقیق پر رکھی جائے۔ تعلیم کو تہذیب سے بہت گہرا تعلق ہے بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک تو تہذیب کے سرمائے کو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل کرنے کا ہی نام تعلیم ہے۔ اس فلسفۂ تعلیم کا مرکزی مسئلہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تہذیب کی حقیقت اور ماہیت معلوم کی جائے تاکہ بچوں اور نوجوانوں کے دل میں اس کا شوق پیدا کیا جاسکے اور انھیں اس کے حاصل کرنے میں مدد دی جاسکے۔

جناب خواجہ صاحب نے اس خطبے میں جو اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اکادمی کے جلسے میں پڑھا گیا تھا اور اب رسالے کی شکل میں شائع ہو رہا ہے نہایت دلآویز طریقے سے تہذیب کے حقیقی مفہوم کو بیان کیا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں ایک فرضی خواب کے نام سے ہماری تہذیب کی موجودہ حالت پر بڑے زور شور سے تنقید کی گئی ہے جو خطیبانہ انداز

کے باوجود مبالغے سے پاک اور اصلیت کے مطابق ہے۔ دوسرے حصے میں تہذیب کے متعلق اصولی بحث اور اس کی تعریف ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہاں بھی موضوع کی خشکی کے باوجود بیان میں خشکی پیدا نہیں ہونے پائی۔ تہذیب کے تمام اہم اجزا کو خواجہ صاحب "رواداری" کے عنوان کے ماتحت لے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رواداری یہاں اصطلاح کے طور پر وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حالی کے مرثیۂ غالب سے "معنیِ لفظِ آدمیت" یعنی تہذیب کی تعریف ڈھونڈ نکالنا خواجہ صاحب کے حسنِ ذوق کی دلیل ہے، اور ان کی "تلاش" قابلِ داد ہے۔ اگرچہ اس کے لیے انھیں گھر سے باہر نہیں جانا پڑا۔

سیّد عابد حسین

روحِ تہذیب

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کازدام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

ایک رات عالمِ خواب میں جب تخیل عقل اور مصلحت کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے، میرا اور ان شیخ کا ساتھ ہو گیا جو حیوانوں اور چوپاؤں سے بیزار تھے اور ایک انسان کی تلاش میں عمر گزار چکے تھے لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنی جستجوئے ناکام کا فسانہ مجھے سنایا کہ کس طرح انھوں نے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں میں ایک ایسے انسان کی جستجو کی جس میں وہ تمام صفحات موجود ہوں جنھیں انسانیت

کے لیے ضروری سمجھتے ہیں لیکن ان کو پے در پے مایوسی کا شکار ہونا پڑا اور ہمیشہ شریف اور مشہور اور نیک نام انسانوں کی شکل میں ریاکاری، جھوٹ اور نفسانیت کے مجسمے ملے۔

میں ان ستم ظریف حضرت کی طبیعت سے واقف نہ تھا۔ بظاہر نہایت سیدھے سادے مردِ معقول معلوم ہوتے تھے۔ میں نے بغیر انجام کو سوچے ہوئے ان سے یہ کہا "شاید آپ کو بدقسمتی سے بُرے لوگوں سے سابقہ پڑا ہوگا۔ میں نے مانا کہ واقعی معنوں میں انسان بہت کم ہیں لیکن بالکل ناپید نہیں۔ میں آپ کو ایک ایسے انسان سے نہیں کئی انسانوں سے ملادوں گا جن میں وہ صفات موجود ہیں جن کا احترام کرنا سب پر لازم ہے۔" وہ مسکرائے اور راضی ہو گئے اور میں نے یہ حماقت کی کہ ان کی رہنمائی کا فرض اپنے ذمّے لے لیا۔

میں نے سوچا کہ سب سے پہلے ان کی ملاقات اپنے ایک نوجوان دوست سے کراؤں جو نہایت مہذب اور تربیت یافتہ ہیں اور میرے خیال میں ایک قابلِ رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندستان کے علاوہ مغرب میں رہ کر اعلا تعلیم حاصل کی ہے۔ گھر سے خوش حال ہیں، خاندانی جائداد کی آمدنی معقول ہے اس لیے نوکری یا کوئی اور کام نہیں کرتے۔ ایک شان دار اور خوب صورت کوٹھی میں رہتے ہیں اور مختلف ادبی تہذیبی مشاغل میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے بہت صاف ستھرا اور شائستہ مذاق پایا ہے۔ انگریزی، اُردو اور فارسی ادب پر اچھی نظر ہے۔ ادب لطیف کی طرز کے مضامین لکھتے ہیں جن میں ایک خاص چاشنی ہوتی ہے۔ شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔

موسیقی سے بہت دل چسپی ہے اور مشرقی اور مغربی موسیقی خوب سمجھتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انگلستان میں رہ کر اور یورپ کی سیاحت کے دوران میں انھیں مغربی مصوری کے شاہکاروں کا مطالعہ کرنے کا اچھا موقع ملا ہے۔ اس لیے تصویروں کے حسن و قبح پر بہت قابلیت کے ساتھ رائے دیتے ہیں۔ گفتگو بہت معقولیت اور شائستگی سے کرتے ہیں اور چونکہ فرصت میں اکثر موجودہ زمانے کے ادب اور جدید تصانیف کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس لیے زمانۂ حال کے رجحانات اور تحریکوں سے باخبر ہیں۔ مختصر یہ کہ خوش نصیبی اور ذاتی قابلیت کی بدولت اپنی زندگی بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے بسر کرتے ہیں اور ہر شخص کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں تہذیب اور شائستگی کے تمام لوازم اور تمام قدریں موجود ہیں۔

خیر میں ان نئے ملاقاتی کو اپنے دوست سے ملانے لے گیا۔ جب ہم لوگ اُن کے یہاں پہنچے تو وہ چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے گراموفون بجا رہے تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی بولے "اس ریکارڈ کو غور سے سُنیے۔ یہ ایک مشہور روسی گیت ہے۔ والگا کے کشتی بان کا گیت جس کو جرمنی کے مشہور اُستاد کرائسلر نے ستار پر بجایا ہے"۔ انھوں نے اس کی تمام خوبیاں اور نکات ہم کو سمجھائے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے بامذاق تحسین کی مدد سے ہم نے اس نغمے سے بہت لطف اُٹھایا۔ پھر انھوں نے چند ہندستانی ریکارڈ بجائے، ان کی راگنیوں کی تشریح کی۔ گانے والوں کی خصوصیات بتائیں۔ مشرقی اور مغربی موسیقی کا فرق مثالیں دے کر سمجھایا۔ اس کے بعد موجودہ رجحانات پر اظہار

رائے کیا۔ بہت سی جدید تصانیف ہمیں دکھائیں جو اُن کے روز افزوں کتب خانے کی زینت ہیں۔ کہنے لگے "میں شاعری میں قدیم کلاسیکی انداز کا قائل ہوں۔ خواہ آپ مجھے قدامت پسند ہی کیوں نہ سمجھیں۔ مجھے نہ نئے موجودہ اُردو شعرا کے نئے اور بھونڈے تجربے پسند ہیں نہ انگریزی شعرا کے وزن اور قافیے سے آزاد شاعری جس میں نہ توازن ہے اور نہ ہم آہنگی۔ بات یہ ہے کہ شعر اور موسیقی میں بہت قریبی تعلق ہے جس شعر میں موسیقی نہ ہو وہ میرے نزدیک شعر ہی نہیں......" کچھ دیر تک اس موضوع پر گفتگو رہی۔ اس کے بعد کچھ ذکر سینما کا چھڑ گیا۔ انھیں سینما کے متعلق غضب کی واقفیت ہے۔ انھیں یہ معلوم ہے کہ ہر مشہور ایکٹر یا ایکٹرس نے کن فلموں میں کام کیا ہے۔ ان کی تنخواہیں کس قدر ہیں، ان کی عمر کیا ہے، آنکھوں اور بالوں کا رنگ کیسا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی کتنی مرتبہ شادی ہوئی ہے اور کتنی مرتبہ طلاق؟ ان کے پاس ایک نہایت خوب صورت چمڑے کی جلد کی نوٹ بک ہے جس میں انھوں نے بترتیب حروف تہجی ان تمام فلموں کی فہرست لکھی ہے جو انھوں نے دیکھے ہیں اور دوسری نوٹ بک میں تمام مشہور ایکٹروں کے حالات درج ہیں۔ انھوں نے اپنے شوق سے ان تصویروں کے بہت سے البم جمع کیے ہیں۔ جن میں متعدد تصویروں پر صاحبانِ تصویر کے دستخط موجود ہیں۔ وہ سینما کو محض تفریحاً نہیں دیکھتے بلکہ اس کو ذہنی اور اخلاقی تعلیم کا ایک زبردست آلہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندستانیوں کی سیاسی تربیت میں بھی اس کو بڑا دخل ہے۔ کیونکہ مغربی تہذیب کا پردہ ان کی نظروں میں اسی

وہ اس گفتگو میں منہمک تھے کہ شیخ صاحب نے چاک کیا ہے...... نے ایک بالکل غیر متعلق بات چھیڑ دی۔ کہنے لگے: "کیوں صاحب آپ تو ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ آپ کے بہت سے گانو ہوں گے کبھی آپ کو وہاں جانے کا بھی اتفاق ہوتا ہے؟"

انھوں نے کہا: "جی ہاں! ابھی کچھ عرصہ ہوا میں اپنے گانو گیا تھا اور کچھ روز وہاں ٹھہرا تھا۔" پوچھا: "آپ کو گانو سے اور گانو والوں سے بھی کچھ دل چسپی اور تعلق ہے یا نہیں؟" انھوں نے کہا: "جی ہاں مجھے گانو سے اور اس کی سادہ زندگی سے بہت دل چسپی ہے۔ برسات ختم ہونے کے بعد، اکتوبر کے مہینے میں، جب زمین زمردیں سبزے اور شفاف پانی سے ڈھکی ہوتی ہے اور میلوں تک ہرے بھرے کھیت لہلہاتے نظر آتے ہیں، میں اکثر ایک آدھ ہفتہ دیہات میں بسر کرتا ہوں۔ شہریوں کی زندگی میں بہت تصنّع اور تکلف ہے۔ کبھی کبھی خود بخود جی چاہتا ہے کہ انسان اس سے بھاگ کر چند روز فطرت کے سادہ اور خوش گوار مناظر کا لطف اُٹھائے۔ میں جب کبھی چند روز اپنے مکان میں بسر کرتا ہوں تو ہمیشہ تازہ دم ہوکر لوٹتا ہوں اور ایک خاص اطمینان اور سکونِ قلب محسوس کرتا ہوں۔ اگر انسان وہاں غلاظت اور گندگی سے محفوظ رہ سکے اور اس کے ساتھ چند کتابیں اور گراموفون وغیرہ ہوں تو تبدیلِ آب و ہوا اور تبدیلِ مقام کے لیے گانو سے بہتر اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟ مزدور اور کاشتکار سب اپنی رعایا ہیں۔ کام کے لیے ہر قسم کی سہولت۔ شکار کا انتظام بہت عمدہ ہو سکتا ہے۔"

شیخ صاحب نے کہا: "جی ہاں، یہ تو میں سمجھا، لیکن میں نے دریافت کیا تھا کہ آپ کو گانو کے لوگوں سے بھی کچھ دلچسپی ہے یا نہیں جو اسی گندگی یا غلاظت میں رہتے ہیں جس سے آپ بھاگتے ہیں اور جن کے پاس نہ گراموفون ہے نہ کتابیں۔ وہ آپ کی رعایا ہیں نا؟ ان سے آپ کے تعلقات اور مراسم کیسے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا: "سنیے شیخ صاحب، میرا عقیدہ ہے کہ زمیندار کو ہمیشہ کاشت کاروں کے ساتھ خوش گوار تعلقات رکھنے چاہییں۔ میرا اصول یہ ہے کہ میں سال میں ایک مرتبہ اپنے دیہات میں ضرور جاتا ہوں۔ اپنے کسانوں اور کاشتکاروں سے ملتا ہوں (مسکرا کر) نذرانہ وصول کرتا ہوں۔ فصل کے حالات دریافت کرتا ہوں۔ ان سے پوچھتا ہوں کہ انھیں کسی بات کی شکایت تو نہیں ہے۔ جو کچھ انتظام یا رعایت وہ کرانا چاہتے ہیں اس کا وعدہ کر لیتا ہوں (دوبارہ مسکرا کر) یہ تو آپ جانتے ہیں کہ وعدہ آسان ہے وعدے کی وفا مشکل ہے۔ میرا اصول ہے کہ زمیندار کو اپنی رعایا کے ساتھ خود نرمی اور مہربانی سے پیش آنا چاہیے تاکہ جب وہ اس سے ملیں تو اسے اپنا محسن اور دوست سمجھیں۔ لگان کی وصولی وغیرہ میں جو کچھ سختی کرنا ضروری ہو اسے کارندوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں نے مانا کہ سختی کے بغیر کام نہیں چلتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ آج کل زمانہ نازک ہے۔ سختی اور نرمی کو ملا کر کام نکالنا چاہیے اور بہترین تقسیم عمل یہی ہے کہ زمیندار خود نرمی سے کام لے اور اس کے کارندے سختی سے! کہیے کیا رائے ہے؟"

شیخ صاحب کو یہ سن کر یارائے ضبط نہ رہا۔ بولے "خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہندستان میں آپ جیسے زمیندار موجود ہیں کیونکہ غریب کسانوں اور کاشتکاروں کی اصلاح اور بہبود کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ خدا زمینداروں کی عقل بالکل سلب اور معطل کر دے اور ان کے انسانی جذبات مفقود ہو جائیں۔ اس وقت انشاء اللہ یہ نظام جو ظلم اور ناانصافی کی بنیاد پر قائم ہے، خود اپنی تباہی کا باعث ہو جائے گا۔ آپ ان جفاکش اور جفا نصیب کسانوں کی محنت میں سے اپنا حصہ "سختی اور نرمی ملا کر" وصول کر لیتے ہیں اور اس کے برتے پر عیش و آرام کی زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ گراموفون بجاتے ہیں۔ شعر و شاعری کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں۔ خوب صورت تصویروں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ آپ ایک مہذب انسان ہیں اور آپ کی طبیعت میں ماشاءاللہ نفاست اس قدر ہے کہ آپ جب گانو میں جا کر تفریح کرتے ہیں تو اس بات کا التزام رکھتے ہیں کہ وہاں غلاظت سے محفوظ رہیں۔ کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ لوگ جو بے زبان جانوروں کی طرح آپ کی خاطر اپنا پسینہ بہاتے ہیں، سال میں ۳۶۵ دن اسی گندگی اور غلاظت میں رہتے ہیں۔ کبھی ان کے لیے بھی آپ نے صفائی یا حفظانِ صحت یا تعلیم کا کوئی بندوبست کیا؟ نہیں! آپ کو اپنی تہذیب اور تفریح کے مشاغل سے اتنی فرصت کہاں کہ آپ یہ دردِ سری مول لیں! آپ نے کبھی اپنے ہاتھوں کو کسی کام یا محنت یا مزدوری سے آلودہ نہیں کیا، آپ کو ان کی زندگی اور قسمت کے لکھے کا کیوں اندازہ ہونے لگا؟

عاشق نہ شُدی محنتِ ہجراں نہ کشیدی
کس پیشِ تو غم نامہ ہجراں چہ سراید"

مگر تہذیب اسے کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ صاحب کی غضب آلود تقریر سن کر بھی میرے دوست کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ اسی اطمینانِ قلب اور شائستگی سے فرمانے لگے "شیخ صاحب! اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ یہ اپنی اپنی رائے ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو صرف ایک ہی زندگی ملتی ہے۔ اسے بار بار تو دنیا میں آنا نہیں ہے۔ اسی زندگی کو غنیمت جان کر اسے چاہیے کہ اس قلیل مدت میں یہاں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے، علم حاصل کرے، دولت اور قوت حاصل کرے، اپنی ذہنی اور ذوقی قوتوں کی تربیت کرے۔ فطرت کے مناظر اور فنونِ لطیفہ کے شاہ کاروں سے لطف اُٹھائے۔ مختصر یہ کہ اپنی زندگی کو خوش باش طریقے پر بسر کرے۔ اگر اسے تمام دنیا کی فکر پڑی رہے گی تو اس سے دنیا کو کچھ فائدہ نہ پہنچے گا اور وہ خود ہر طرح کی تہذیب و تربیت سے محروم رہ جائے گا۔ دنیا میں واقعی ضرورت انفرادیت کو مستحکم کرنے کی ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی فکر رکھے تو یہ نہ صرف اس کے لیے مفید ہے بلکہ سوسائٹی کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ آج کل لوگ جذبات کی تنگی اور دل کی کمزوری سے بے بس ہو کر بجائے اپنی ترقی اور اصلاح کی کوشش کرنے کے تمام دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں لیکن اس جذبات نوازی سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ معاف کیجیے گا آپ کو میری باتیں شاید ناگوار گزریں۔ آپ غالباً خود غرضی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ مگر میری رائے یہ ہے

کہ خود غرضی ہی پر عالم کا نظام قائم ہے اور صحیح طور پر قائم ہے۔ اگر میں بھی جا کر گاؤں میں رہنے لگوں گا اور لوگوں کی طرح ہل چلاؤں اور بیلوں کی رکھوالی کروں تو دنیا میں ایک غلیظ جاہل بدمذاق کسان کا اضافہ ہو جائے گا اور (معاف کیجیے) ایک اچھے خاصے تعلیم یافتہ، خوش مذاق، باتہذیب انسان کی کمی! ممکن ہے کہ آپ اس تبدیلی کے لیے تیار ہوں لیکن میں اس کو کسی طرح اچھا نہیں سمجھتا۔"

جب ہم لوگ وہاں سے نکلے تو شیخ صاحب کا چہرہ بہت غضب آلود تھا۔ دروازے کے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ بہت زور سے کہا: "لاحول ولاقوۃ الّا باللہ! ارے بھئی تم نے مجھے کس نقلی انسان سے ملا دیا۔ یہ شخص زیادہ سے زیادہ ایک بہروپیا ہے یا ایک نمایش پسند جوان۔ کیا تم سنجیدگی سے یہ خیال کرتے ہو کہ اس شخص کو جو فنونِ لطیفہ سے سطحی دل چسپی رکھتا ہے اور خود غرضی کے فلسفے کی تلقین کرتا ہے، تہذیب سے کوئی سروکار ہے؟ بے شک تہذیبِ نفس کی تکمیل کے لیے ذوقِ سلیم ایک نہایت ضروری چیز ہے۔ لیکن اتنا ہی جتنا کسی عمارت کے لیے خوب صورت اور موزوں ہونا۔ اگر عمارت ہی نہ ہو تو کس چیز کو خوبصورت بناؤ گے! اس کا خیال ہے کہ وہ فنونِ لطیفہ میں بہت دستگاہ رکھتا ہے، یہ سراسر غلطی ہے۔ جس شخص کو خدا کے بے شمار بندوں کے کام کاج اور محنت مزدوری سے کوئی سابقہ نہیں پڑا، جس کو کبھی دکھ اور مصیبت اور افلاس کی خلش محسوس نہیں ہوئی، جس نے کبھی انسانوں کے مشترک اغراض و مقاصد میں حصہ نہیں لیا اس کو فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے خیالات اور

نظریوں کی بنیاد الفاظ پر قائم رکھتا ہے جس کی حیثیت محض اتنی ہے کہ وہ ہوا میں تموج پیدا کرتے ہیں اور بس۔ ان کی پشت پناہی کے لیے کوئی شدید اور پُرخلوص ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک شاعر جو اپنی لافانی نظم سے دنیا کو مالا مال کرتا ہے محض خوبصورت الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے؟ نہیں اس میں اس کے تلخ اور شیریں تجربات کا عطر ہوتا ہے۔ اس کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے۔ اس کے دل کے تار تمام انسانوں کے دُکھ درد کے لیے لرزتے ہیں اور ان کے ارتعاش کی وجہ سے اس کے الفاظ ہر شخص کے دل میں اُتر جاتے ہیں جو شاعر ان تجربات کی دولت سے محروم ہے جس کو خود غرضی نے تنگ حدود میں قید کر دیا ہے وہ ممکن ہے ایسے شعر کہہ دے جو کانوں کو بھلے معلوم ہوں اور عارضی طور پر دل کو بھائیں لیکن وہ ہرگز کسی قدرِ مستقبل کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اور یاد رکھو کہ شاعری سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے بھی وہی شرائط ہیں جو اچھا شعر کہنے کے، اور یہی حال تمام فنونِ لطیفہ کا ہے۔ ان سب کی بنیاد وہی محنت اور مزدوری اور دستکاری ہے جس کو آپ کا شاعر دوست حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور مجھے اس پر صرف یہی اعتراض نہیں کہ وہ فنونِ لطیفہ کی اہمیت کا غلط اندازہ کرتا ہے اور ان کا مفہوم نہیں سمجھتا۔ یہ تو ضمنی بات ہے۔ مجھے تو اس کے تمام فلسفۂ حیات پر اعتراض ہے اور اس سے اختلاف ہے۔ عزیز من آج کل ہندستان میں خاصی تعداد ایسے خوش پوش، ذہین اور بظاہر خوش نصیب نوجوانوں کی ہے جن کو قدرت نے سوءِ اتفاق سے ہر قسم کے مواقع

دیے ہیں۔ آسودگی دی ہے۔ دماغ اچھا دیا ہے۔ ان کی تعلیم مروجہ نظام کے مطابق بہت اعلا پیمانے پر ہوئی ہے مگر ہر لحاظ سے بالکل بے کار بلکہ باعثِ ضرر ہیں۔ بے کار اس لیے کہ وہ کسی مفید تعمیری کام میں حصّہ نہیں لیتے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے اغراض و مقاصد میں، اپنی ذاتی دل چسپیوں میں محصور رہنے کو مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔ کسی عظیم الشان اور سنجیدہ مقصد کے ساتھ خود کو وابستہ نہیں کرتے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی انفرادی قوتوں کی نشو و نما بھی نہیں ہونے پاتی۔ کیوں کہ کوئی شخص اس وقت تک خودیابی کی منزل پر نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ کسی اہم مقصد کے اندر گم نہ کردے۔ وہ مضر اس لیے ہیں کہ دوسروں کے لیے ایک غلط لیکن کشش رکھنے والی مثال قائم کرتے ہیں۔ وہ خود تہذیب کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں لیکن چونکہ ان کی جماعتی حیثیت اچھی ہوتی ہے اس لیے ان کے خیالات کی اشاعت ہوجاتی ہے اور قوم میں غلط قدروں اور غلط معیاروں کا رواج ہوجاتا ہے۔ لوگ نمایشی یا سطحی چیزوں کو مستقل اہمیت رکھنے والی چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے، مفلس اور آسودہ حال، تعلیم یافتہ اور جاہل ہر قسم کے لوگ جھوٹے بُتوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ میں اس قسم کے آدمیوں کو انسان نہیں سمجھتا مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو اور اپنا وعدہ پورا کرو۔"

ان کی یہ تمام باتیں سن کر میں بہت گھبرایا۔ مگر میں نے یہ سوچا کہ شاید اس قسم کی تہذیب کی وہ صحیح قدر نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے خود ان کی تربیت بہت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی ہو اس

لیے میں انھیں ایک خدا رسیدہ عالم کے پاس لے گیا جن کے تقدس کی بہت دھوم تھی اور جن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ محض ان کے پاس بیٹھنے سے دل کی سیاہی کافور ہوجاتی ہے اور ایمان چمک اُٹھتا ہے۔ یہ بزرگ عبا و قبا میں ملفوف ایک عالمانہ دستار سر پر باندھے ایک تخت پر متمکن تھے۔ ان کے گرد کچھ فاصلے پر چند طلبہ اور ملاقاتی مؤدب دو زانو بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے نصیحت آمیز کلام پر سر تحسین ہلا ہلا کر بجا و درست کہہ رہے تھے۔ ہم نے بھی باادب سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ مولانا اس وقت دورِ حاضرہ کی بے دینی اور دہریت پر گفتگو فرما رہے تھے۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ مغربی تعلیم کی وجہ سے نوجوانوں کے دماغ میں آزادی کی مسموم ہوا سرایت کر گئی ہے۔ وہ مذہب اور اس کے عقائد و عبادات کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے ہیں۔ علمائے دین کا کماحقہ احترام نہیں کرتے اور اگر یہی حالت قائم رہی تو کیا عجب ہے کہ پروردگار عالم ان پر اپنا قہر و غضب نازل فرمائے جیسا کہ اُس نے امم سابقہ پر کیا تھا۔ اس خوف ناک تہدید پر حاضرین نے مختلف انداز میں عبرت و تاسف کا اظہار کیا اور ایک طالبِ حق نے یہ سوال کیا کہ "قبلہ و کعبہ! اس عذابِ الٰہی سے بچنے کا بھی کوئی طریقہ ہے یا نہیں۔ سرکار اپنی زبان سے کوئی ایسا عمل یا اسم تلقین فرمائیں، جو حرزِ ایمان ہو اور ہم لوگوں کے خیالات کو راہ راست سے بھٹکنے نہ دے"۔ قبلہ و کعبہ نے ارشاد فرمایا کہ "جو لوگ مذہب سے توسل رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ہر معاملے میں علمائے دین سے استصواب

کریں اور ان کے ارشاد کے مطابق عمل کریں اور اپنی کوتاہ عقل کو ہر جگہ دخل نہ دیں۔ میں تمھیں ایک دعا بھی لکھ دوں گا۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ لوگ خلوص سے عبادت گزاری کریں اور خوفِ خدا ہر وقت اپنے دل میں رکھیں لیکن (یہاں پہنچ کر ان کی آواز میں رعب اور جلال کی شان پیدا ہوگئی) وہ عاقبت ناشناس لوگ جنھوں نے اپنے دلوں میں شکوک کو جگہ دی وہ خدا اور محافظینِ شریعت کے احکام پر بے چون وچرا عمل نہیں کرتے اور ہر بات کی وجہ دریافت کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ ان کے لیے حکم الٰہی بالکل صریح ہے۔ "فجزأھم جھنم خالدین فیھا" بخدائے عزو جل اگر دنیا میں علمائے دین کا وجود نہ ہوتا جن کی مثال انبیائے بنی اسرائیل کی ہے تو یقیناً اس امت ناہنجار پر قہرِ الٰہی نازل ہو چکا ہوتا۔"

اس ارشاد کو سن کر تمام حاضرین پر بالکل سناٹا طاری ہوگیا۔ ان کو اس وقت صریحاً یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ ان کے درمیان سے یہ چند بابرکت ذاتیں اٹھ جائیں تو دنیا کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ اس خموشی کو میرے ساتھی نے نہایت دھیمے اور مؤدب لہجے میں یہ کہہ کر توڑا "مولانا! جناب نے یہ تو بالکل درست ارشاد فرمایا کہ آج کل لوگوں میں بے دینی کا رواج بڑھتا جا رہا ہے لیکن اپنی زبان معجز بیان سے اتنا اور ارشاد فرما دیجیے کہ بے دینی کی روزافزوں اشاعت کی وجہ کیا ہے اور علمائے دین کی مقتدر جماعت کے ہوتے ہوئے اس کا تدارک کیوں نہیں ہو سکتا؟" مولانا نے ذرا چونک کر ان کی

طرف دیکھا کیونکہ ان کو ایسے لوگوں سے بالعموم سابقہ نہ پڑتا تھا جو اس قسم کے سوالات ان سے کریں۔ انھوں نے کہا " حضرت میں نے ابھی تو بیان کیا تھا کہ مروجہ بے دینی کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے ان کے خیالات کو خراب کر دیا ہے۔ شک کی لعنت ان کے دلوں میں پیدا ہوگئی ہے۔ وہ علمائے دین کی عزت اور اُن کے مرتبے کو نہیں پہچانتے اس لیے وہ ان کی طرف رجوع نہیں کرتے اور جہالت و ضلالت کے سمندر میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم ان کی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں؟ جب خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی حکمتِ کاملہ اور مصلحتِ عالیہ سے ان کے دلوں کو حق کی جانب پھیر دے گا اور وہ ہماری طرف رجوع کریں گے، اس وقت انشاء اللہ المستعان ہم ان کی ہدایت کا انتظام کر سکیں گے۔"

یہ بات سن کر بجائے خاموش ہونے کے شیخ صاحب کج بحثی پر اُتر آئے اور بولے " مولانا! معاف کیجیے گا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر خداوند عالم از خود اپنی حکمتِ کاملہ سے ان نوجوانوں کے دلوں کو حق کی طرف پھیر دے گا تو اُس وقت آپ کی ہدایت کی کیا ضرورت رہے گی۔ کیا ہدایتِ الٰہی کے بعد بھی کسی انسانی ہدایت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ میری رائے ناقص میں تو یہ بات آتی ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو پورا کرنے کے لیے مختلف وسیلوں اور واسطوں سے کام لیتا ہے اور خود جناب نے بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اُمّت کی ہدایت اور نجات کا وسیلہ علمائے دین کی جماعت ہے۔ اس لحاظ سے تو جناب پر یہ فرض عائد ہے کہ لوگوں کی اصلاح کے لیے

جدوجہد کریں اور ان کو راہ راست پر لانے کی تدابیر سوچیں، ورنہ محض ہادی کا دعوا کرنا کافی نہیں"۔

مولانا کو شیخ کی یہ گستاخی اور آزادیِ رائے ناگوار گزری لیکن انھوں نے تحمّل سے کام لے کر فرمایا "حضرت میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ "لاتخسوافی امور اللہ" جن معاملات کو انسان نہیں سمجھ سکتا ان میں اسے اپنی عقل نہیں لڑانی چاہیے۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ خدائے عزوجل کے احکام اور مصلحت کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں؟ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم احکامِ الٰہی اور ان کے مفہوم و معانی آپ تک پہنچائیں اور آپ کا فرض ہے کہ ہماری تعمیل کریں اور ہدایت و ضلالت کے مسئلے پر رائے زنی نہ کریں۔ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے ضلالت کی طرف لے جاتا ہے۔"

یہ حکمِ قاطع سن کر ہمارے شیخ صاحب کا تحمّل ختم ہو گیا اور انھوں نے اپنے مؤدب لہجے اور دھیمی آواز کو خیرباد کہہ کر ایک پُرزور تقریر کر ڈالی۔ فرمانے لگے:

"جناب! آپ لوگوں کی عادت ہے کہ بغیر سوچے سمجھے ہر مسئلے پر ایک حکمِ قطعی لگا دیتے ہیں اور اس کی تائید میں کوئی غیر متعلق آیت اور روایت دستیاب نہ ہو تو کوئی عربی جملہ سُنا دیتے ہیں اور اس طرح آزادیِ رائے اور اظہارِ خیال کا سدِ باب کر دیتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ مذہب پر ایمان رکھنے کے معنی ہیں آنکھیں بند کر لینا؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی سب سے بڑی تعلیم یہ ہے کہ عقل کی آنکھیں کھول ڈالو اور ضرور ہر معاملے میں تلاش، جستجو، طلبِ حق کرو۔ ختم رسل

کے بعد وحی و الہام کا دروازہ بند ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب انسان اپنی عقل اور فکر کے دروازے کھول ڈالے۔ لیکن آپ اس کی اجازت نہیں دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے جس قدر باتیں بیان فرمائیں سب غلط ہیں (اس پر اِدھر اُدھر کے لوگوں نے کچھ اظہارِ ملامت کرنا چاہا لیکن شیخ صاحب کی تقریر کے دھارے کو نہ روک سکے) اسلام نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ انسان اپنی عقل اور رائے کو معطل کردے اور اپنے تمام شکوک و شبہات کا گلا گھونٹ دے۔ آزادیِ رائے انسان کا سب سے زیادہ قابلِ قدر حق ہے اور عقل خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ جب انسان ان سے دستبردار ہو گیا تو اس کے پاس کیا رہ جائے گا؟ رہا شکوک کا پیدا ہونا سو یہ فطرت کا مقتضیٰ ہے۔ اگر ان کی تشفی نہ کی جائے بلکہ عذابِ الٰہی اور اس سے بھی کہیں زیادہ علمائے دین کے غیض و غضب سے ڈرا کر انھیں دبا دیا جائے تو اس کا نتیجہ ہمیشہ روحانی ہلاکت ہوتا ہے۔ ایک سچے اور فطرت شناس عالم کا تو یہ فرض ہے کہ وہ نوجوانوں کے شکوک کی پذیرائی کرے، ان کو کرید کرید کر معلوم کرے اور اپنے زیادہ گہرے اور ہمہ گیر علم کی مدد سے ان کی تشفی کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ چونکہ ان کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے ہیں اس لیے وہ مذہب اور علمائے دین کی طرف سے بے اعتنائی اور رُو گردانی کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ چونکہ آپ ان کے شکوک کی تشفی نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے اس لیے وہ آپ کی طرف سے بدظن ہیں۔ آپ نے مذہب کو ایک طلسم یا بھول بھلیاں بنا رکھا ہے اور اس میں

چاروں طرف نہایت خوف ناک اوامر اور نواہی کھڑے کر دیے ہیں تاکہ کسی شخص کو جو شروع ہی سے ہر معاملے میں پوری طرح ہار نہ مان لے، اس کے قریب پھٹکنے کی ہمت نہ ہو۔ آپ صرف ان لوگوں کے ساتھ سروکار رکھنا چاہتے ہیں جو ہر بات میں ہاتھ باندھ کر بجا و دُرست کہیں اور کبھی اختلاف رائے کی جرارت نہ کریں۔ پھر آپ کو دوسرے لوگوں سے یہ شکایت ہی کیوں ہے کہ وہ آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ آپ نے کبھی ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی ان کی مشکلات سے ہمدردی نہیں کی۔ کبھی دورِ حاضرہ کے تمدنی مسائل پر غور کر کے اصول و قوانین کو ان پر منطبق نہیں کیا۔ آپ نے تمام تمدنی انقلابات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے، تمام جدید مطالبات حیات کی طرف سے روگردانی کر کے چند الفاظ اور علامات، اور لوگوں کو ڈرانے دھمکانے پر قناعت کی۔ آپ مذہب کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے مکان پر عزت اور آرام اور کم و بیش آسودگی کی زندگی بسر کریں۔ کبھی کبھی نماز پڑھا دیا کریں۔ آپ سے جو مسئلہ پوچھا جائے اس کے متعلق اپنا فتوا دے دیں اور اگر کوئی شخص آپ سے اختلاف کرے تو اس کو کافر قرار دیں۔ اگر کوئی جدید تحریک شروع ہوتی ہے جس میں آپ سے رائے نہ لی جائے اور جس کا افتتاح آپ کے متبرک ہاتھوں سے نہ ہو تو آپ اس کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ خود دنیاوی جاہ و عزت اور آسایشوں سے کنارہ کش نہیں ہوتے لیکن آپ کی زبانی تلقین و تعلیم یہی ہے کہ دین اور دنیا دو مختلف چیزیں ہیں اور دنیاوی مفاد کے لیے جد و جہد کرنا گناہ ہے۔

اگر کوئی شخص مذہب کے ظاہری ارکان کو پورا کرتا رہے لیکن معاملات میں بد دیانت اور ناانصاف ہو تو اس کی گرفت کرنا آپ اپنا فرض نہیں سمجھتے۔ انسانوں کی زندگی نوّے فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ دنیوی معاملات اور کاروبار کی زندگی ہے۔ اس کی اصلاح کرنا، اس کو اصولِ عدالت کے ماتحت منظم کرنا آپ کا اصلی فرض تھا لیکن آپ ان کی زندگی کے دس فی صدی حصّے پر قانع ہو گئے ہیں اور اس میں بھی آپ نے مذہب کو، جو ابتدا میں ترقی اور ہمت اور حوصلے کا ضامن تھا، جمود اور قدامت پرستی کا مترادف بنا دیا ہے آپ سے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اپنے مقامِ معزز کو چھوڑ کر اٹھیں۔ خدا کی دنیا اور خدا کے بندوں میں گھومیں پھریں۔ ان سے ملیں جلیں۔ افلاس، جہالت، توہم پرستی، بیماری اور ظلم و ناانصافی کے دردناک مناظر کو دیکھیں اور انھیں دور کرنے کے لیے اپنا پسینہ بہائیں۔ لباس، اندازِ گفتگو اور شانِ علم میں عزت نہیں۔ عزت تو خدمت میں ہے لیکن خدمت سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں۔ کیا آپ کے اور ہمارے ہادی اور سردارِ کائنات محمد مصطفےٰ صلعم نے اشاعتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ الحق کا فرض اسی طرح انجام دیا تھا جس طرح آپ انجام دیتے ہیں یعنی کیا وہ اپنی جگہ آرام سے بیٹھے رہتے تھے اور جس کسی کو فقہ اور شریعت کے مسائل دریافت کرنے ہوتے وہ خود حاضرِ خدمت ہوتا اور مسئلہ پوچھ کر چلا جاتا تھا؟ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو کیا انھیں وہ عظیم الشان کامیابی ہو سکتی تھی جو ہوئی۔ ہرگز نہیں۔ انھوں نے چالیس برس تک بے غرضی اور بے نفسی کے ساتھ لوگوں کی خدمت کی۔ غریبوں، مظلوموں،

بیماروں، محتاجوں، بے کسوں اور کمزوروں کی دادرسی کی۔ ان کی خاطر مزدوروں کی طرح کام کیا اور اپنی شانِ امانت کا سکّہ دوست دشمن سب کے دلوں پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ہر طرح کے خطروں اور آزمایشوں کو جھیل کر خدا کا پیغام ہر جگہ سُنایا اور اس فرض کی ادائیگی میں جس قدر تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھانی پڑیں، انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ جب کوئی شخص اخلاقِ محمدّی کا خفیف سا پرتو اپنی ذات میں پیدا کرلے، جب وہ اپنے نفس کو زیر کرکے دوسروں کے رنج و راحت کو اپنی ذاتی آسایش اور آرام پر ترجیح دینے لگے، جب وہ سچ کی خاطر ہر قسم کی تحریص و ترغیب کو ٹھکرا دے، جب وہ سردار بننے کے بجائے خادم بننے کی کوشش کرے، اس وقت علمارِ امتی میں ہونے کا دعوا کرے۔ ورنہ ایک خاص وضع بنا کر "شانِ علم" پیدا کرلینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ جنابِ مولانا! آپ میری گستاخی معاف کر دیجیے، مگر میرے الفاظ پر غور کیجیے۔ یہ نہ دیکھیے کون شخص یہ باتیں کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھیے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اپنی شانِ تقدس اپنے ادعائے بزرگی کو خدا حافظ کہیے، خداوند عزوجل کی بارگاہ میں انسانوں کا ایک دوسرے پر تفوق جتانا اور خود کو مافوق البشر سمجھنا نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کو واقعی دین کی حمایت مقصود ہے اور آپ بے دینی کے سیلاب کو روکنا چاہتے ہیں تو دوسرے انسانوں کی طرح انسان بن جائیے اور ان میں مل جل کر، ان کے درمیان رہ کر ان کی خدمت کیجیے۔ آزاد خیالی اور مغربی تہذیب و تمدّن پر الزام رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر آپ کو اجتہاد کا دعوا ہے تو اسلام کی تعلیم کو ایسے انداز میں

پیش کیجیے کہ موجودہ تہذیب و تمدّن کو کلیتاً مسترد نہ کردے بلکہ اس کے بہترین عناصر کو اپنے اندر ضم کرلے اور لوگوں کی فلاحِ دارین کا باعث ہو یعنی ان کے دین اور دنیا دونوں کو سدھارے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ سے عیسائی مشنری بہتر ہیں جو مدرسے کھولتے ہیں۔ دواخانے جاری کرتے ہیں۔ لوگوں کو صفائی اور حفظانِ صحت کے اصول سکھاتے ہیں۔ غریبوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ان کی مذہبی تلقین غلط سہی، ممکن ہے ان کی نیت مشکوک ہو لیکن ان کی معاشرتی خدمات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے میرا بازو پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر بہت تیزی کے ساتھ مکان سے باہر نکل گئے۔ قبل اس کے کہ مولانا ان کو عذابِ الیم کی بشارت دیں اور حاضرینِ مجلس جن پر حیرت اور غصّہ دونوں طاری تھے، ان کی اچھی طرح خبر لیں۔

جب میرے ہوش و حواس ذرا ٹھکانے ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ "حضرت! آپ برائے خدا اس قسم کی حرکتیں نہ کیجیے ورنہ آپ کے ساتھ میری بھی شامت آجائے گی۔" انھوں نے کہا کہ "تم ان ذرا ذرا سی باتوں کا خیال نہ کرو۔ ایسے مواقع مجھے آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ انسان کی تلاش جوکھوں کا کام ہے۔ پھولوں کی سیج نہیں۔" میں نے دبی زبان سے کہا "جی ہاں خصوصاً ایسی حالت میں جب اس میں بُت شکنی کا فرض بھی شامل ہو۔ مگر یہ تو فرمائیے آپ کو ان صاحب سے کہاں کی دشمنی تھی کہ آپ نے ان کی اس بُری

طرح سے لے دے کر ڈالی اور ان کی بزرگی اور مرتبے کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ ان مولوی صاحب کی علمی معلومات بہت وسیع ہیں۔ وہ ہر شخص سے اخلاق اور مروّت سے پیش آتے ہیں۔ عبادت گزار ہیں۔ بہت پاک زندگی بسر کرتے ہیں۔ سوائے اس قلیل نذرانے کے جو ان کے بعض معتقد از خود پیش کر دیتے ہیں اور وہ بھی اس زمانے میں بہت کم ہو گیا ہے، ان کا اور کوئی وسیلۂ معاش نہیں لیکن وہ اسی پر قانع ہیں۔ اگر علمیت اور اخلاق، عبادات اور قناعت، نیک نفسی اور مرنجاں مرنجی، تہذیب اور انسانیت کے اجزا نہیں ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ انسانیت سے کیا مراد لیتے ہیں؟"

انھوں نے کہا کہ عزیزِ من تمھاری نظر سطحی خوبیوں سے خیرہ ہو جاتی ہے۔ اوّل تو تم نے جس قدر صفات گنائی ہیں ان کا مفہوم میرے نزدیک وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ دوسرے ان صفات کو تہذیب و انسانیت سے کوئی لازمی تعلق نہیں۔ مجھے جس انسان کی تلاش ہے اس کے لیے عالم ہونا، لوگوں سے اخلاق و مروّت برتنا اور عبادت گزاری کرنا لازم نہیں۔ میں تو عالمِ دین بھی ایسا چاہتا ہوں جس کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کا دامنِ تقدس عوام کے ساتھ ملنے جلنے اور ان کے دُکھ اور ان کے مشاغل میں شرکت کرنے سے آلودہ ہو جائے گا۔ جو انسان بن کر رہے خود کو حیوانوں میں فرشتہ نہ سمجھے۔ جو محض "گلیمِ خویش" کو بچا کر لے جانے کی فکر نہ کرے۔ بلکہ دوسرے ڈوبتوں کو نکالنے کے لیے جدوجہد کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہو مجھے خاص کر ان مولوی صاحب کے متعلق نہ کوئی علم ہے اور نہ ان سے کوئی ذاتی

پرخاش یا شکایت. ممکن ہے وہ اپنی ذات سے بہت اچھے اور نیک آدمی ہوں۔ اس معنی میں جو اچھے اور نیک کے عرف عام میں سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی مختصر سی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ انھوں نے ابھی مذہب کی الف بے کو بھی نہیں سمجھا۔ میں اس طبقۂ علما کے بہت سے افراد کو جانتا ہوں جنھوں نے اپنی علمیت اور تقدس کو گویا ایک لبادہ بنا بنا کر اپنے گرد لپیٹ لیا ہے۔ اور دنیا کی جد وجہد اور رنگ و دو اس کی تکلیفوں اور تحریصوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ ان کی عبا و قبا کو اس علاحدگی کی ایک علامت سمجھنا چاہیے۔ یاد رکھو کہ مذہب کو زیادہ نقصان ان لوگوں سے پہنچتا ہے جو بظاہر اس کے محافظ اور حامل ہیں لیکن روحِ مذہب تک نہیں پہنچتے ہیں اور نیک نیتی کے ساتھ لوگوں کو گمراہ یا بددل کرتے ہیں۔ لوگ ان کو اپنا راہ نما مانتے ہیں۔ ان کے افعال و اقوال کو اپنے لیے سند بنا لیتے ہیں اور اس طرح رہبر اور راہ رو دونوں نہایت نیک نیتی کے ساتھ اس راستے پر پڑ لیتے ہیں جو ان کو منزلِ مقصود سے بالکل مخالف سمت لے جاتا ہے۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

ان کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ شاید ان کو مذہبی لوگوں سے بھی کوئی دل چسپی نہیں بلکہ وہ طبعاً ان کے مخالف ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ انھیں ایک ایسے صاحب سے ملاؤں جن میں نہ صرف وہ خوبیاں ہیں جو بقول شیخ صاحب نظر کو خیرہ کرتی ہیں بلکہ وہ صفات بھی ہیں جن کے وہ خود قائل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں انھیں

اس مرتبہ ایک نہایت مشہور و ممتاز بیرسٹر کے پاس لے گیا جنھوں نے تعلیم جدید کے اعلا ترین منازل کی تکمیل کی ہے۔ ان کی علمی و انتظامی قابلیت، ان کی ایمان داری، ان کی اقبال مندی کا تمام میں شہرہ ہے اور قوم و حکومت دونوں کی نظر میں ان کی بہت قدر و عزت ہے۔ ان کی رائے ہر معاملے میں نہایت وقیع اور ذمّے دارانہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اکثر قومی تحریکوں کے رکن بلکہ سرگردہ ہیں۔ پبلک جلسوں، تعلیمی اور معاشرتی انجمنوں کے صدر منتخب ہوتے ہیں اور اپنے فرائضِ منصبی کو ایسی قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ محض ان کی موجودگی سے جلسے کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ان کی صدارت سے ان کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان کو خدا نے دولتِ علم کے ساتھ دولتِ دنیا کی نعمت بھی دی ہے۔ جس میں سے ایک کافی حصّہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ قومی تحریکوں اور طلبہ کی امداد پر صرف کرتے ہیں۔ بہرحال بحیثیت مجموعی وہ قوم کے ایک نہایت مفید، معزّز اور سرگرم رکن ہیں۔ بیرسٹر صاحب ہم لوگوں سے بہت تپاک سے ملے اور تھوڑی تمہیدی گفتگو کے بعد انھوں نے پوچھا کہ "فرمائیے، آپ کو ملک کے موجودہ سیاسی معاملات سے بھی کوئی دلچسپی ہے یا نہیں؟" میں نے کہا "جی ہاں اخبار تو دیکھتا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گتھی کیسے سلجھے گی؟" کہنے لگے "اب تو معاملات بالکل سلجھ گئے ہیں، ہندستان کا سیاسی مستقبل روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ ہمیں بہت جلد فیڈرل حکومت مل جائے گی۔ اسمبلی اور کونسلیں اپنی ہوں گی۔ آپ لوگوں کو جو نوجوان اور تعلیم یافتہ ہیں (میں نے دل میں سوچا کہ میرے ساتھی کو

تو دونوں باتوں سے انکار ہے۔ وہ نہ نوجوان ہیں نہ تعلیم یافتہ۔ اچاہیے کہ ان جدید مواقع سے فائدہ اٹھائیں اور کونسلوں میں جا کر قومی خدمت کریں اور اپنے مفاد کا تحفظ کریں۔ آج کل سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں کونسلوں پر مزدوروں کا' اچھوتوں کا' کانگریس وغیرہ کا قبضہ نہ ہو جائے۔ یہ لوگ یا تو اعتدال کی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں یا ان میں قدرتاً یہ صلاحیت نہیں کہ وہ سیاسی ذمّے داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام زمیندار' سرمایہ دار اور معقول خیالات کے تعلیم یافتہ لوگ مل جل کر ایک مکمل نظام قائم کریں کہ ملک کی حکومت ان کے ہاتھوں میں آجائے اور انھیں کے ہاتھوں میں رہے۔ ورنہ بہت بدامنی اور نقصان کا اندیشہ ہے۔"

بیرسٹر صاحب کے لہجے اور اندازِ گفتگو میں تیقّن اور اطمینان کی ایسی شان پائی جاتی تھی کہ اگر کوئی شک وشبہ کسی کج فہم کے ذہن میں پیدا بھی ہوتا تو وہ شرم کے مارے فوراً دور ہو جاتا۔ لیکن شیخ صاحب عجیب آدمی نکلے، کہنے لگے: "جنابِ من! آپ کو یہ فکر کیوں لگی ہوئی ہے کہ حکومت دولت مندوں اور زمینداروں کے ہاتھ میں رہے۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ جمہوری حکومت یا ذمّے دار حکومت کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت میں سب لوگوں کا حصّہ ہو۔ سب اس میں شریک ہوں اور اس کا نظام ایسا قائم کریں کہ سب کے مفاد کی حفاظت ہو......" وہ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ بیرسٹر صاحب بیچ میں بول اُٹھے۔ ان کی ذہنی تیزی اور جودت کی ایک علامت بلکہ ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ دوسروں کی بہت کم سنتے ہیں اور اپنے خیال

کو بہت سرعت کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ کہنے لگے (اور ان کے لہجے میں بے انتہا وثوق تھا۔ کچھ تمسخر کی چاشنی تھی اور کچھ وہ رحم اور ہمدردی جو ہر جاننے والے بے وقوفوں یا جاہلوں کی باتوں پر ہوتی ہے) جی ہاں میں نے بھی کتابوں میں اس قسم کی باتیں پڑھی ہیں اور پلیٹ فارم پر تقریر کرنے والے بھی اس قسم کے دلفریب خیالات ظاہر کر کے لوگوں کو دھوکا دیا کرتے ہیں لیکن ہم آپ جو تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہیں جن پر سوشلزم وغیرہ کے خراب اور خطرناک خیالات کا اثر نہیں ہوا اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ ملک میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کی بے انتہا دولت لگی ہوئی ہے۔ زراعت، تجارت، صنعت وحرفت کا نظام انھی کی وجہ سے قائم ہے۔ اگر وہ اپنے حقوق اور مفاد کی حفاظت نہیں کریں گے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ غیر ذمے دار لوگ اور جماعتیں ملک کے بنے بنائے نظام کو درہم برہم کر دیں گے اور ایسے قوانین بنائیں گے کہ ہم لوگوں کی پوزیشن اور حقوق خطرے میں پڑ جائیں گے۔ کیا آپ اس خوفناک انجام کی پذیرائی کرنے کے لیے تیار ہیں؟ جناب عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان عملی دنیا میں عملی قوانین کی پابندی کرے، خیالی اور ہوائی باتوں پر اپنے قلعے کی بنیاد نہ رکھے۔"

شیخ صاحب کو پھر تردید کے مرض نے مجبور کیا اور بولے:

"جی ہاں میں تو بہت خوشی سے اس خوفناک انجام کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوں جس سے آپ خود ڈرتے ہیں اور دوسروں کو ڈرانا

چاہتے ہیں۔ ڈر ان ہی پر طاری ہوتا ہے جن کے دل میں چور ہوتا ہے اور ان تمام جماعتوں کے دل میں چور ہے جن کی آپ نیابت کرتے ہیں۔ آخر سرمایہ داروں کے پاس سرمایہ کہاں سے آیا؟ ان ہی غریبوں اور مزدوروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے، جن کو آپ ہر قسم کے سیاسی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ آپ لوگوں نے کونسلوں اور حکومت کے نظام پر قبضہ کر کے ایسے قوانین بنا دیے ہیں جن کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ آپ کے غصب کردہ حقوق اور آسایشوں کی حفاظت کریں اور خدا کے بے شمار بندوں کو اقل ترین انسانی حقوق سے محروم رکھیں۔ یہ کہاں کی تہذیب ہے اور کہاں کا انصاف ہے کہ کچھ لوگ تو دنیا کی تمام نعمتوں پر قابض ہو کر بیٹھ جائیں اور عیش و فرصت کی زندگی بسر کریں اور باقی تمام نوع انسانی کے حصے میں محنت اور مصیبت آئے۔ نہ انھیں پیٹ بھر کھانا نصیب ہو نہ تن ڈھانک کپڑا۔ آپ کو اندیشہ ہے کہ ہندستان کی جدید حکومت کہیں ایسے قوانین نہ بنائے جن سے آپ کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔ میں کہتا ہوں کہ دیر یا سویر ایسا ہونا اٹل ہے۔ آپ سیلاب کی یورش کو کچی مٹی کے گھروندوں سے نہیں روک سکتے۔ آج کل تمام دنیا کا یہی رجحان ہے کہ قانون سازی سوشلزم کے اصولوں پر کی جائے۔ میں خود سوشلزم کا زیادہ قائل نہیں۔ مجھے اس کی بعض باتوں سے اختلاف ہے۔ لیکن آپ کو اس سے کسی طرح مفر نہیں ملے گا۔ خود انگلستان میں جو سب سے زیادہ قدامت پسند ملک ہے اور جس کو ہر معاملے میں اپنا نمونہ اور مطمح نظر سمجھتے ہیں۔ پارلیمنٹ برابر ایسے ہی قانون بنا رہی ہے جو دولت اور

سیاسی قوت کی تقسیم انصاف اور مساوات کے اصولوں پر کریں۔ عام اس سے کہ حکومت قدامت پسندوں کی ہے یا مزدوروں کی، وہ ایسا کرنے پر مجبور رہے۔ آپ کب تک اپنے ملک میں شیشے کے گھر بنا کر رہنا چاہتے ہیں؟ اور شیشہ بھی ایسا نازک کہ اگر کوئی ذرا سی کنکری بھی اُٹھاکر پھینکے تو سارا مکان چکنا چور ہو جائے۔ رہے آپ کے زمیندار اور ان کی تنظیم سو اس کا خدا کے فضل سے کوئی اندیشہ ہی نہیں! کبھی آپ نے آج تک دیکھا ہے کہ مُردہ گھوڑے چابک کی مار سے دوڑے ہوں؟ آخر ان کے سامنے کون سا ایسا ولولہ پیدا کرنے والا نصب العین ہے، کون سا مطمحِ نظر ہے جو ان میں نئی روح پھونکے گا؟ روپے کی تھیلیوں کی حفاظت؟ ایک حرف تو غلط یا صحیح، عوام النّاس کے سامنے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنانے کا نصب العین پیش کیا جا رہا ہے جو انھیں ایثار اور قربانی کا جوش دلاتا ہے اور دوسری طرف آپ اُن مُردہ ڈھانچوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی چوری کے مال کی حفاظت کریں! بیرسٹر صاحب! آپ تو ایک ایسی لڑائی لڑ رہے ہیں جس میں آپ کی شکست یقینی ہے.....!"

بیرسٹر صاحب اس تقریر کے دوران نہایت پیچ و تاب کھا رہے تھے اور انھوں نے کئی مرتبہ شیخ صاحب کی بات کاٹنا چاہی لیکن یہ چوکتے ہو چکے تھے اور ان کو اس کا موقع نہیں ملا۔ اب جو وہ بہ تقاضائے عمر سانس لینے کے لیے رُکے تو بیرسٹر صاحب نے اس مہلت کو غنیمت جانا اور فوراً میدان میں کود پڑے "جناب! مجھے معلوم نہیں تھا کہ بہ ایں سن و سال آپ کے خیالات اس قدر مہمل

اور خراب ہیں اور آپ کے دماغ پر روس مسلط ہے۔ آپ کو کچھ معلوم بھی ہے کہ آپ کے اس پسندیدہ ملک میں لوگوں کی کیا حالت ہے (میں یہ سُن کر تعجب سے اُن کا منہ دیکھنے لگا۔ کیونکہ شیخ صاحب نے تو روس کا نام تک نہ لیا تھا) وہاں نہ مذہب باقی رہا ہے، نہ اخلاق نہ آزادی، نہ حیا، نہ غیرت، انسان مشین کے غلام بن گئے ہیں۔ کسی کو اپنی انفرادیت، اپنی مخصوص قابلیت کو تربیت کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کا مقصد زندگی صرف اتنا ہی ہے کہ وہ کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ چیزیں پیدا کریں اور دنیا کے بازاروں میں ان کا ڈھیر لگادیں۔ اور اپنے فاسد خیالات کی اشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کریں۔ ان کی حماقت کا یہ حال ہے کہ وہ انسانوں میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں جو فطرتِ انسانی اور مصلحتِ الٰہی دونوں کے خلاف ہے۔ جب دنیا میں تمام لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جب دو آدمی بھی ایسے دستیاب نہیں ہو سکتے جن کی دماغی قابلیتیں ایک سی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان میں زبردستی مساوات قائم کردی جائے یا سب کی مالی حیثیت ایک سی ہو جائے۔ کیا کسی سلیم العقل انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ ایک جج یا وزیر کو وہی مشاہرہ دیا جائے جو ایک خاکروب یا مالی کو ملتا ہے؟ اگر ایسا ہو تو لوگوں کو کام کرنے کی، محنت کرنے کی کیا تحریص رہے گی؟ انھیں کام سے دل چسپی کیوں ہوگی؟ یہ تو انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ ممکن ہے آپ جیسے چند لوگ ایسے نکل آئیں جن میں روحانیت اس درجہ بھری ہوئی ہو کہ وہ اس مضحکہ خیز صورتِ حال پر قانع ہو جائیں۔ لیکن عام لوگ جن سے آئے دن ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے

کبھی اس پر راضی نہیں ہو سکتے۔ ان باتوں سے آپ یہ مطلب نہ نکالیے گا کہ میں غریبوں کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا یا ان کی مدد نہیں کرنا چاہتا مجھے ان سے بہت ہمدردی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مزدوروں کو اپنی محنت کا مناسب معاوضہ ملے اور فقیروں، محتاجوں، بے وسیلہ لوگوں کے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔ ہمارے مذہب نے خیرات کرنے کا حکم دیا ہے، اس کو پورا کرنا چاہیے۔ زمینداروں کو کاشتکاروں اور مزدوروں کے ساتھ مہربانی اور رعایت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہم خدا کے بنائے ہوئے امتیازات کو پس پشت ڈال دیں اور عقل و مصلحت کو فراموش کر کے ایک ناممکن العمل آئیڈیل کے پیچھے سرگرداں رہیں۔۔۔۔۔ اچھا معاف کیجیے گا مجھے اس وقت ایک جلسے میں جانا ہے۔ خدا حافظ، پھر ملاقات ہوگی۔" بیرسٹر صاحب مقدمہ جیت کر رخصت ہوئے اور مجھے شیخ صاحب کے طوفان تکلم میں گرفتار چھوڑ گئے۔ کچھ تو خیالات کا ہجوم کچھ اس زک کی خفگی کہ انھیں بیرسٹر صاحب کو قائل کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ باہر نکلتے ہی مجھ پر برس پڑے۔

"کیوں صاحب آپ کو انھی حضرت کی ذات اور صفات پر ناز تھا؟ انھی کو آپ انسان کامل سمجھتے ہیں؟ آخر آپ کس چیز سے اس قدر مرعوب اور متاثر ہیں؟ شہرت سے؟ وہ تو ہر قسم کے لوگوں کے حصے میں آتی ہے اور اس کے حاصل کرنے کے لیے اکثر ایسی تدبیریں اور وسیلے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کی طرف ایک شریف آدمی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا روادار نہ ہوگا۔ دولت سے؟

میں دولت کو فی نفسہ برا نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دولت کی طمع میں لوگ جس قدر ذلیل حرکات اور ظلم کرتے ہیں اتنا اور کسی وجہ سے نہیں کرتے اور میں نے ایک بہت بڑے بزرگ کا یہ قول بھی سنا ہے کہ کوئی امیر آدمی اس وقت تک آسمانی حکومت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ گزر جائے۔ دماغی قابلیت سے؟ بے شک عقل اور ذہانت خدا کا بہت بڑا عطیہ ہے لیکن جو شخص اس کو محض اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے اور اس کے ذریعے بندگانِ خدا کی خدمت نہ کرے، وہ مجرم ہے اور کفرانِ نعمت کا مرتکب۔ عزیزمن! تم نہیں جانتے کہ بعض اوقات لوگ باوجود ہر قسم کی قابلیت اور مواقع میسر ہونے کے دنیا میں کوئی مفید اور دیرپا کام نہیں کر سکتے اور باوجود بہت بڑے آدمی ہونے کے درحقیقت بہت چھوٹے آدمی ہوتے ہیں۔ جانتے ہو اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں کے جن میں تمھارے ممدوح کا شمار بھی ہے، دل اور دماغ بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور آدمی میں یہ سب سے المناک کمی ہے۔ انسانیت وسعت چاہتی ہے۔ دل کی وسعت، دماغ کی وسعت، نظر کی وسعت، ایسا دل جس میں علاوہ اپنے دکھ درد کے دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے۔ ایسا دماغ جس میں اپنی مخصوص دلچسپیوں اور مشاغل کے علاوہ دوسروں کے نقطۂ نظر اور اختلافات کو سمجھنے کی صلاحیت ہو جو دوسروں کی رائے اور خیالات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرے۔ ایسی نظر جس پر گھوڑے کی طرح اندھیریاں نہ لگی ہوں جو دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھ سکے۔ جس کو نہ صرف اپنے

گرد و پیش کی چیزیں اور اپنی فوری ضروریات اصلی معلوم ہوں بلکہ مستقبل کے امکانات بھی اس کے لیے ایسی ہی اہمیت رکھتے ہوں، جو ہر نصب العین کو محض اس وجہ سے مسترد نہ کر دے کہ وہ اس کو نظر نہیں آتا۔ ہر قسم کی تنگی اور تنگ نظری تہذیب و انسانیت کے منافی ہے لیکن ان لوگوں کے نہ دل ہیں وسعت ہے نہ دماغ ہیں، نہ نظر ہیں۔ ان میں نہ رواداری ہے نہ دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت۔ جو خیال ایک دفعہ ان کے ذہن میں آجاتا ہے اس کو صحیح سمجھتے ہیں خواہ دوسرے لوگ کچھ بھی کہیں۔ ان کے دماغ میں کبھی یہ تکلیف دہ مگر حیوان کو انسان بنانے والا خیال نہیں گزرتا کہ ممکن ہے وہ کسی معاملے میں غلطی پر ہوں۔ تم نے فطرتِ انسانی کے متعلق اس بڑے آدمی کے خیالات کو سنا اور لطف یہ ہے کہ اگر کوئی روز تک مسلسل اس شخص سے اس مسئلے پر گفت گو کرتا جب بھی اس کے خیالات میں کوئی فرق نہ آتا بلکہ وہ مجھے مجنون سمجھ کر چھوڑ دیتا اور اپنے خیالات میں اور پختہ ہو جاتا۔ ہر معاملے میں اس کے خیالات بالکل سطحی ہیں۔ افلاس کے مسئلے پر ارشاد ہوا تھا کہ میں اس بات کے لیے آمادہ ہوں کہ ہم خیرات کے طور پر اپنے دسترخوان کے ٹکڑے غریبوں کے سامنے جھاڑ دیں۔ لیکن وہ اس خیال کو جنون کی علامت سمجھتا ہے کہ افلاس کو دور کرنے اور دولت کو بہتر تقسیم کرنے کے لیے مناسب ذرائع اختیار کیے جائیں۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ غلاظت کو جہاں تک ہو سکے چھپانے کی کوشش کرو۔ دور کرنے کی فکر نہ کرو۔ کپڑا پھٹے تو اسے بدلو، نہیں پیوند پر پیوند لگاتے جاؤ۔ کیوں کہ اس مفکرِ اعظم کے خیال میں ہر قسم کی بنیادی اور دور رس تبدیلی انقلاب ہے اور

انقلاب مصلحتِ الٰہی کی مخالفت! اس کے نزدیک قانون اور انصاف بالکل ایک ہی چیز ہیں اور اگر کوئی شخص انصاف کی حمایت میں قانون کو بدلنا چاہے یا اس کی مخالفت کرے تو اخلاقی اور قانونی مجرم ہے۔ وہ ان محتاط لوگوں کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس نے دو ہزار برس ہوئے حضرت عیسیٰ کو اس لیے پھانسی دے دی تھی کہ ان کی تعلیم مروجہ خیالات اور عقائد کے خلاف تھی جو چودہ سو برس ہوئے پیغمبر اسلام کی مخالفت پر اس لیے کمربستہ تھے کہ وہ عدل اور مساوات اور اخوت کا انقلاب آفریں اور خطرناک پیغام دنیا کو پہنچا رہے تھے۔ بھائی! ان حیوانوں سے جو انسان ہونے کا دعوا کرتے ہیں بالکل عاجز آ چکا ہوں۔ مجھے کسی انسان کے پاس لے چلو۔"

اب تو میں چکرایا کیوں کہ میرے ترکش میں جو سب سے زیادہ کارگر تیر تھے ان کو میں یکے بعد دیگرے چھوڑ چکا تھا لیکن اس مردِ شریف نے ہر ایک کو نہایت آسانی سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا تھا۔ میں اسی ششش و پنج میں تھا کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کروں کہ امدادِ غیبی آڑے آئی یعنی دفعتاً میری آنکھ کھلی اور میں نے خود کو بستر پر پڑا پایا۔ اس وقت مجھے خیال پیدا ہوا کہ ہمیں دراصل اس مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تہذیب کے اصلی اور حقیقی عناصر کیا ہیں اور ہم کن صفات رکھنے والے آدمی کو مہذب کہہ سکتے ہیں۔

تہذیب کا ایک نظریہ وہ ہے جو مذہب اور اخلاق کی تعلیم سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے پیش کیا ہے جو انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کو مقدم اہمیت دیتے ہیں اور انسان کی اخلاقی اور مذہبی سیرت کو

زیادہ پختہ اور مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق سیرت انسانی کی تہذیب کے لیے اس قسم کی صفات لازم ہیں جیسے صداقت، ایمان داری، عقیدے کی پختگی، ایثار اور خلوص۔ اگر اس کے مطمحِ نظر کو ایک لفظ میں ادا کیا جا سکے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان کو مجاہد بنانا چاہتے ہیں جو ایمان اور عقیدے کا پکا ہو، شکوک و شبہات سے محفوظ ہو، اپنے عقائد پر سختی سے عامل ہو، اور اس کی اشاعت و تبلیغ کے لیے ہر قسم کی ایثار و قربانی کے لیے تیار ہو، اس سے یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگ جو مذہبی ہونے کا یا مذہبی سرگرمی کا دعوا کرتے ہیں وہ ان اوصاف سے متصف ہوتے ہیں یا ان سب کی تائید کرتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دُنیا کی تاریخ میں مذہب کی تعلیم کے اثر سے بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے ان صفات کا اظہار کیا ہے اور جریدۂ عالم پر اپنا سکہ دوام ثبت کر دیا ہے۔

تہذیب کا دوسرا نظریہ ان لوگوں کا ہے جو انسانی زندگی کے اجتماعی اور تمدّنی پہلو کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر زور دینا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی میل جول داد و ستد، مراسم اور تعلقات میں لطف اور خوشگواری پیدا کریں۔ اس معنی میں مہذب شخص وہ کہلاتا ہے جس کو آدابِ محفل سے بخوبی واقفیت ہو، لوگوں کے ساتھ شایستگی اور مروّت سے پیش آئے۔ ان کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہ لگائے اور کم از کم ان کا ظاہراً احترام کرے۔ اس سے ان کی مُراد صرف اتنی ہی نہیں کہ

روز مرّہ کے میل ملاقات میں ناگواری پیدا نہ ہو بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے انسان اپنے حقوق اور فرایض کو پہچانے اور اپنے اقوال و اعمال کی حدود سے واقف ہو کر زندگی بسر کرے۔ جو لوگ اس کا خیال نہیں کرتے وہ نہ صرف دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بلکہ انجام کار خود بھی زک اُٹھاتے ہیں۔

تہذیب کا تیسرا مفہوم جو صدیوں تک تعلیم کی بحثوں اور تعلیم کے عمل پر مسلط رہا ہے، یہ ہے کہ انسان میں بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں ایسی ہیں جو ترتیب کی محتاج اور اظہار کے لیے بے چین ہیں۔ ان کی ایک قدر مستقل ہے خصوصاً ان قوتوں کی جن کا تعلق ادب اور فنونِ لطیفہ کی تحصیل اور تخلیق و تحسین سے ہے۔ تہذیب یافتہ ہونے کے معنی ہیں ان قوتوں کی تربیت اور ابھار، انسان کی زندگی محض حیوانی خواہشات تک محدود نہیں بلکہ ان کو تلاشِ حق اور مشاہدۂ جمال کی کاوش بھی رہتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیٹس کے لیے ہر حسین مرقع دائمی مسرت کا سرمایہ تھا۔ اسی کی طرح ہر تہذیب یافتہ انسان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ حسین مناظر اور اشیا سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس میں حُسن شناسی کی قابلیت ہو۔ وہ ادب، موسیقی، مصوری اور شاعری کی تخلیق و تحسین کا ذوق رکھتا ہو۔ اسی مفہوم کے مطابق آرٹسٹ کے انہماک میں ہمیں تہذیب کی شان نظر آتی ہے اور آرٹ کی نیرنگیوں میں ایک مہذب انسان کے لیے زندگی کا مشغلہ موجود ہے۔ لیکن کام، محنت، مزدوری، دستکاری وغیرہ جس کے ذریعے عام لوگ

اپنی روزی کماتے ہیں، مقابلتاً حقیر اور کم درجے کے مشاغل ہیں جن کو نہ صرف یہ کہ تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ وہ ان لوگوں کے تہذیب حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدّت تک بلکہ اب بھی آزاد یا لبرل تعلیم سے دماغی تعلیم یا فنونِ لطیفہ کی تعلیم مُراد لی جاتی ہے اور جسمانی محنت اور مشاغل کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔

ان تینوں نظریوں میں سے ہر ایک میں بعض قابلِ قدر عناصر ایسے ہیں جن کے امتزاج سے تہذیب نفس کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بجائے خود اس کے پورے اور صحیح مفہوم پر حاوی نہیں بلکہ اگر ان میں سے کسی ایک پر بھی شدّت اور مبالغے کے ساتھ عمل کیا جائے تو انسان کی تہذیب و تربیت ناقص رہ جائے گی۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ تم مکمل تہذیب یافتہ انسان کی تصویر پیش کرو تو اس کے خدوخال بنانے میں شاید سب سے پہلے میں رواداری کی صفت کو پیش کروں۔ ممکن ہے کہ آج کل کے زمانے میں جب ہر جماعت بلکہ ہر فرد اپنے مخصوص اور بظاہر جداگانہ مفاد کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اور جماعتی وفاداری اور تعصب کو تقریباً ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے، یہ کہنا بے وقت کی راگنی ہو لیکن میرا پُرخلوص عقیدہ یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں کے لیے رواداری کی صفت پیدا کیے بغیر تہذیب کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ بہت سے نیک نیت اور نیک نفس لوگوں کی خوبیوں پر محض اس وجہ سے پانی پھر جاتا ہے کہ ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی وہ اپنی زندگی کو خود اپنے اور دوسروں کے لیے ایک عذابِ مستقل بنا لیتے ہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں گزرتا کہ عذابِ الٰہی

اس امر کی مقتضی ہے کہ انسانوں میں اختلافات ہوں اور وہ اس کا احترام کریں۔ سائنس اور جمہوریت کے اس دور میں جب انفرادیت کی تکمیل کے بغیر قومی ترقی ناممکن ہے، تنگ نظری اور تعصب خودکشی کا حکم رکھتا ہے۔ دماغی بیداری اور نشوونما اسی جماعت میں ممکن ہے جس کے افراد میں ذہنی کشادگی ہو۔ جن کی دلچسپیاں متنوع ہوں جو علاوہ اپنی تنگ اور محدود ذاتی اغراض و مقاصد کے دوسرے مسائل میں بھی دلچسپی کے ساتھ شرکت کریں۔ ہندستانی تہذیب کی تباہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی شدّت کے ساتھ تعصب اور تنگ نظری سرایت کر گئی ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس بیسویں صدی میں جب کہ ہندو مذہب پانچ ہزار سال پُرانا ہو چکا ہے۔ مہاتما گاندھی کو اچھوتوں کی آزادی کے لیے اپنا نقدِ حیات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے عقیدے کے مطابق، باوجود ہر قسم کی علمی اور فنّی ترقی کے اور ان تمام کارناموں کے جو ہندستان کے امتیاز کا باعث ہیں، ایسی سوسائٹی جو اس طرح انسانی حقوق اور رواداری کا خون کرے سراسر نفیِ تہذیب کرتی ہے۔

یہی حکم تمام قدیم تمدنوں اور معاشرتوں پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے مختلف صورتوں میں اپنے بعض افراد کی حق تلفی کی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان پر ظلم کو روا رکھا۔ خواہ وہ غلامی کی رسم ہو یا عورتوں کی حق تلفی ہو یا کمزور اقوام کے حقوق پر دست درازی ہو، بے شک اس اصول کے قائم کرنے سے ہمیں افلاطون کے زمانے کی سوسائٹی سے لے کر امریکہ جیسے متمدن اور مہذب ملک تک کی شان میں گستاخی

کرنی پڑے گی اور خود ہندستان کے احساس کو ٹھیس لگے گی لیکن ہم کسی طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ صحیح انسانی تہذیب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمام انسانوں سے رواداری اور عدل کا برتاؤ کریں۔ جو فرد یا جماعت اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ تہذیب سے سراسر عاری ہے خواہ اس کی سطحی تہذیب کیسی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو۔

رواداری کے مفہوم میں ایک طرف تو یہ داخل ہے کہ انسان دوسروں کے جذبات اور خیالات کو سمجھے اور ان کا احترام کرے اور اپنی ذات میں اس درجہ وسعت پیدا کرے کہ اس میں دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے دوسری طرف اس میں یہ صفت بھی شامل ہے کہ انسان دوسروں کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کے ساتھ جانچے اور ایک سخت گیر قاضی کی طرح ان پر حکم لگانے کے بجائے ایک اہلِ دل انسان کی طرح ان کی وجہ اور علّت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ یعنی اسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے زیادہ اس بات کی فکر اور کاوش ہو کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹا کر اس راستے پر ڈال دیا۔ جو شخص ہمیشہ دوسروں کے لیے محتسب بنا رہتا ہے، ان کی عیب جوئی کرتا ہے، ان کی لغزشوں کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ ان پر سختی کرنا اور انھیں عذابِ الیم کا مزا چکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے، وہ ممکن ہے کہ ایک اعلا اخلاقی سیرت کا مالک ہو لیکن وہ تہذیب کے ایک نہایت لازمی اور شیریں عنصر سے محروم ہے۔ اس میں وہ فراخدلی اور رواداری نہیں ہے جو مجرم اور جرم میں امتیاز کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے دل میں ایک بدبخت مجرم کو دیکھ کر بھی یہ خیال گزرتا ہے کہ اگر توفیقِ الٰہی شاملِ

حال نہ ہوتی تو کیا عجب ہے آج ہم بھی اسی حالت میں ہوتے۔ یعنی وہ صفت جس کی بدولت عارضی اور اتفاقی فرق کی بنا پر ہم اپنی مشترک انسانیت کا احساس نہیں کھونے پاتے۔ یہ وہ حقیقی انسانی ہمدردی رحم اور انکسار ہے جو بعض لوگوں میں فطرتاً ودیعت ہوتا ہے اور بعض میں بہت سے تجربے اور آزمایشیں اُٹھانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور بعض پر اس کا ذرا سا پرتو بھی نہیں پڑتا۔ ایسی ہمدردی اور فراخدلی کی مثالیں ہمیں ادب میں ملتی ہیں اور اگر ہم خوش قسمت ہوں تو عملی زندگی میں بھی کبھی ایسے انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اس تہذیب حقیقی کے حامل اور شمع بردار ہیں۔ وہ باوجود اپنے مواقع کے تنگ اور محدود ہونے کے، باوجود جاہل اور ناواقف اور ناتجربے کار رہنے کے اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ایثار، محبت، ہمدردی اور رواداری سمجھنے اور معاف کرنے کے ایسے خزانے رکھتے ہیں جن کے مقابلے میں حقیقت بیں نظروں کے سامنے علم اور تجربے کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ بے شک علمی مشاغل اور مذاق کی مناسبت اور اتحاد بہت ہی قابلِ قدر چیزیں ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو اپنے دوستوں اور عزیزوں میں یہ نعمت میسر ہو۔ لیکن ان سے زیادہ وقیع ہیں ہمدردی کے وہ رشتے جن کو موت بھی نہیں توڑ سکتی۔ کس کام آئیں گی آخری ساعت میں دماغی مناسبت اور اتحاد اور وہ ذہنی رشتے جن کو قائم کرنے کا لوگوں کو شوق ہوتا ہے۔ اس وقت انسان کو یہ چیزیں اپنے اصلی رنگ میں نظر آئیں گی۔ یعنی یہ کہ وہ زندگی کی محض بیرونی نمایش ہیں۔ بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے ڈرتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسرے بھی اس

خوف میں شریک ہوں یا اس خوف کی نفسی وجہ اس کو سمجھائیں۔ وہ اس سرگرم اور محبت بھری آغوش کی تلاش کرتا ہے جس میں پناہ لے کر اپنے ڈر کو بھلا سکے۔ اسے اس شفیق اور تسکین بخش ہاتھ کی تلاش ہوتی ہے جس کو تھام کر وہ اس خوف کا مقابلہ کر سکے۔ بے شک امید، ایمان اور صداقت ضروری ہیں لیکن ضرورت ہے انسانیت کے لیے سب سے زیادہ بعض ہندستانی ماؤں کی سی محبت کی جس میں انتہائی بے نفسی ہو، صبر ہو، اَن تھک تحمل ہو۔ ایسی محبت جس کو خطائیں اور لغزشیں کم نہ کر سکیں، جو کسی معاوضے کی طالب نہ ہو جس میں محبت الٰہی کی جھلک ہو۔ اس کے مقابلے میں اور تمام انسانی تجربے اور جذبات ہیچ اور پوچ ہیں۔

رواداری کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے دو باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ بھی سمجھوتا کرنے کو تیار ہو جائے اور جرم اور گناہ کے ساتھ رواداری برتے، نہیں! اسے جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں تمیز کرنی چاہیے: بحیثیت ایک با اخلاق آدمی کے اس کا فرض ہے کہ وہ جرم کے تدارک کی کوشش کرے اور اس کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کرے، لیکن بحیثیت ایک انسان کے اسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی رکھنی چاہیے اور انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں نے جن کو ادعار تقدس تھا اور اپنے متعلق بہت خوش فہمی تھی، میری میگڈلین پر لعنت ملامت کی بوچھار کی اور اس کو سنگسار کرنا چاہا تو اس عارفِ ربانی نے جس کی نظر اوروں سے زیادہ گہری، دل اوروں سے زیادہ فراخ اور روادار تھا۔ اپنی آواز بلند کی:

"پہلا پتھر وہی شخص پھینکے جس نے خود کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہاتھ جو پتھر پھینکنے کے لیے اُٹھے تھے اپنی اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گئے اور کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ دل کے چور کو فراموش کر کے نظر کے سامنے والے چور پر ہاتھ اُٹھائے۔ اسی طرح جب رسالت مآبؐ بحیثیت ایک فاتح کے دوبارہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے اہل مکہ کے ہاتھوں ہر طرح کی ایذائیں اور بے حُرمتی اُٹھائی تھی۔ جہاں لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کا خاتمہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا تو آپ کی زبان پر یہی اعلان تھا کہ "لاتثریب علیکم الیوم" اور دل میں یہ دعا تھی کہ "بارالٰہا تو میری قوم کی خطاؤں سے درگزر کر کیوں کہ وہ لاعلمی اور جہالت میں گرفتار ہیں۔ اسی طرح اس جلیل القدر پیغمبر کے برگزیدہ نواسے نے جو تاریخ عالم کا سب سے بڑا مجاہد تھا خلق اور رواداری کی یہی شان کربلا کے میدان میں دکھائی جب کہ وہ ایسی مصیبتوں اور آزمایشوں میں گھرا ہوا تھا جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، ان کی تمام عمر عبادتِ الٰہی اور خدمتِ اسلام میں بسر ہوئی ہے۔ اس کے مخالف وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف اسلام اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے بلکہ شقاوت اور ظلم میں درندوں سے بھی کہیں بدتر ہیں لیکن یہ خدا کا محبوب بندہ باوجود اپنے زبردست تقدس اور عظمت کے اپنی انسانی ہمدردی کو زندہ رکھتا ہے اور قاتل کے خنجر کے نیچے بھی، سجدے میں پڑا ہوا ان ظالموں کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ یہ ہے تہذیب و انسانیت کا انتہائی کمال جس کی پیروی کرنے کی کوشش اور آرزو ہر انسان کو کرنی چاہیے خصوصاً ان لوگوں کو جنھیں اسلام سے توسل کا دعوا اور اس پر فخر ہے کیونکہ

خود پیغمبر اسلام نے اپنی وجہ بعثت بتائی تھی کہ بُعثت لاتمم مکارم اخلاق (میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) اور لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ "تخلقوا باخلاق اللہ" (خود کو اخلاقِ الٰہی سے متصف کرو) اخلاق کا یہ تقاضا نہیں کہ انسان ذرا سی نیکی کرکے اوچھے برتن کی طرح چھلک پڑے۔ نہ خطاکاروں کے حالات پر غور کرے نہ ان کی نیت معلوم کرنے کی کوشش کرے بلکہ ایک بلند مقام سے ان پر حکم لگانا شروع کردے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں عزت اس شخص کی ہے جس کو تقوا یعنی خوفِ خدا ہو "ان اکرمکم عند اللہ اتقکم" اور سب سے بڑا گناہ غرور اور تکبر ہے جس نے ابلیس کو جو فرشتوں کا سردار تھا ہمیشہ کے لیے ذلیل و خوار کردیا۔ جو زاہد اپنے زہد اور اتقا پر نازاں ہے اس کی عبادت گزاری کی پیش کش بھی درگاہِ الٰہی میں قبول نہیں لیکن ممکن ہے کہ وہ نکتہ نواز اس رند کو سرفراز کردے جو نیازمندی کی شان سے اس کے سامنے جھکتا ہے:

زاہد غرور کرد سلامت نہ بُرد راہ
رنداں رہِ نیاز بدارالسلام رفت

دراصل تہذیب کا مسئلہ عدل اور توازن کا مسئلہ ہے یعنی ہمیں مختلف قوتوں اور مطالبات کے درمیان بلکہ مختلف اچھی اور مستحسن صفات کے درمیان ایک خاص تناسب قائم کرنا ہے۔ ہم نے ابھی غرور اور نیازمندی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں سچی تہذیب ہم سے بیک وقت ایسی صفات کی طالب ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں۔ ایک طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان

کو بحیثیت انسان ہونے کے اپنی حقیقی وقعت اور عظمت کا احساس ہو اور
وہ یہ جانے کہ وہ بے شمار امکانات کا مالک اور حامل ہے جن کو عمل
میں لانا اور ان کے ذریعے عالم فطرت کو تسخیر کرنا اس کا فرض ہے۔
سائنس کی ترقی نے انسان کی عقل کو بڑی حد تک توہمات کی زنجیروں
سے آزاد کردیا ہے اور اسے اس کے فطری ماحول پر بہت بڑی قدرت
حاصل ہوگئی ہے۔ جو شخص عاجزانہ تقدیر پرستی کا شکار ہوجائے اور
دنیا میں جو عالم اسباب ہے ہاتھ باندھ کر بیٹھ رہے وہ کوئی مفید
کام انجام نہیں دے سکتا۔ ہمارے نزدیک نہ وہ تہذیب یافتہ ہے
نہ بن سکتا ہے کیونکہ ہم تہذیب کے فعّالی مفہوم کے قائل ہیں اس کو
ایک جامد اور مجہول بنانے کے لیے تیار نہیں۔ جب اس میں اس
احساس کی بدولت صحیح عزتِ نفس پیدا ہوتی ہے وہ نظام عالم میں
اپنی اہمیت کو پہچانتا ہے اور یہ خود شناسی معرفتِ الٰہی کا زینہ ہے
یہ پاسِ نفس اسی شخص میں پیدا ہوسکتا ہے جس کے اعمال کی محرک
خود اس کی ذات ہو۔ دوسروں کی تقلید یا خواہشِ تحسین یا خوفِ ملامت
اس کا راہبر نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خود غرض
یا نفس پرست ہو، بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کے خیالات
اور عقائد اس کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ جانے کہ بحیثیت
انسان کے اسے ایسی آزادیِ فکر و عمل حاصل ہے جس سے کوئی
قوت اسے محروم نہیں کرسکتی۔ جن لوگوں کے جذبات و خیالات اور
اعمال و افعال دوسروں کا عکس ہوتے ہیں وہ محض رسم و رواج یا
فیشن کے غلام ہوکر رہ جاتے ہیں اور ان میں نہ حقیقی جرارت پیدا ہوتی

ہے نہ عزتِ نفس۔ ایسے شخص کو ہم اپنے نظریے کے مطابق مہذب کہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس عزّتِ نفس کے ساتھ ساتھ جو انسان سے اس کے مکانات کا احترام کراتی ہے، اسے یہ بھی احساس ہونا چاہیے کہ کائنات کی بے اندازہ وسعت کے مقابلے میں اس کی ہستی بہت چھوٹی اور کمزور ہے اور باوجود اس کی علمی اور عملی ترقی اور انکشافات کے اس کا علم وقدرت دونوں محدود ہیں۔ یہ خیال اس کے دل میں سچّا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جو غلط اور جھوٹی خاکساری سے بہت مختلف ہے۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس عجز کی وجہ سے انسان کے عملی قوا معطل نہیں ہو جاتے بلکہ ان کو جد و جہد کی دعوت ملتی ہے لیکن وہ اپنی کامیابی پر غرور نہیں کرتا۔ نیوٹن جیسے عالم متبحر کا یہ قول کہ "علم کے بحرِ زخّار کے سامنے میری واقفیت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچّہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے کھیل رہا ہو" تہذیبِ نفس اور مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے اور سچّے عجز کی نہایت عمدہ مثال ہے۔

دنیا میں جس قدر صحیح معنوں میں بڑے آدمی گزرے ہیں ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ انھوں نے اپنی ذات کے متعلق کبھی غرور یا تکبّر نہیں کیا۔ انھوں نے کبھی دوسرے انسانوں کو ذلیل نہیں سمجھا اور ان کے مقابلے میں اپنی فوقیت نہیں جتائی۔ یہ تہذیب اور شرافت کی بہت بڑی پہچان ہے۔ ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے ایک قدرِ مستقل کا مالک ہے اس لیے کسی کو اپنے علم یا وجاہت یا پرہیزگاری کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو حقیر سمجھے۔

ایسے لوگ خواہ وہ جلیل القدر پیغمبر ہوں جیسے حضرت عیسیٰؑ، آنحضرتؐ یا معاشرتی اور سیاسی رہنما جیسے مہاتما گاندھی، ہمیشہ انسانوں سے ان جیسے انسان بن کر نکلتے ہیں، ان کے پاس آنے، ان سے ملنے جلنے، اپنا دکھ درد اور اپنی کمی اور کمزوری ان کو بتانے میں معمولی سے معمولی آدمی کو بھی باک نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ مثلاً بعض انتخاب کے امیدواروں کی طرح مصنوعی اور جھوٹے انکسار سے کام لے کر، اپنی بلندی سے اتر کر دوسروں کی سطح پر آئیں بلکہ وہ قدرتاً اور خود بخود دوسروں کو اپنی سطح تک بلند کر لیتے ہیں کیوں کہ ان کی انسانیت مصلحتِ وقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دلی جذبات اور فطری احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ میں کسی ایسے شخص کو مہذب انسان ماننے کے لیے تیار نہیں جو انسان کی حرمت کو نہ پہچانے اور تنگ ظرفی کی وجہ سے خود کو ہمیشہ دوسروں سے بلند تر اور بزرگ تر سمجھے۔ جو شخص تقدس کا دعوا کرتا ہے یا اپنی دولت، علمیت یا وجاہت نسبی کی بنا پر غریبوں، جاہلوں یا کم حیثیت لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے، وہ نہ صرف تہذیب سے عاری ہے بلکہ اس میں احساسِ تناسب اور ذوقِ ظرافت بھی مفقود ہے کیونکہ وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ خدا کی کائنات کس قدر وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں اس کے بلند آہنگ دعاوی کیسے مضحک اور مہمل معلوم ہوتے ہیں۔ مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ اس قادر مطلق کی نظر میں ہر قسم کی خدمت کی وقعت اور اہمیت یکساں ہے بشرطیکہ وہ خلوص سے کی جائے۔ خواہ کسی ملک کی سیاست کا چلانا ہو یا زمین کا کھودنا۔ مذہب کی تبلیغ کرنا ہو یا سڑکوں اور مکانوں کی

غلاظت دور کر کے ان کی صفائی کرنا۔ ہم اس بات کی وجہ اور مصلحت نہیں سمجھ سکتے کہ کیوں ایک شخص کے حصّے میں شہرت اور عزّت و افتخار کی زندگی آتی ہے یا کسی مہتم بالشان مقصد کے لیے شہرت اور ناموری کے ساتھ جان دینا اور دوسرے کے حصّے میں ایک ایسی زندگی جو شروع سے آخر تک اندھیرے میں ٹٹولنے کے مانند ہو اور جس کا انجام گمنامی اور ذلّت ہو۔ ہم یہ نہیں جانتے لیکن ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو مفید کام بھی خلوص کے ساتھ کیا جائے وہ مقبول ہے اور اس کی وقعت مسلّم۔

لہٰذا ہم تہذیب کے لیے ایک شرط لازم یہ قرار دیتے ہیں کہ ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتے کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے ملاتا ہے اور کسی خارجی یا نمایشی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے برتر اور اعلا تر نہ سمجھے۔ نہ ہی اسے کسی شخص کو اس بنا پر حقیر سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ اس کے کام کی نوعیت بہت معمولی ہے یعنی یہ کہ مثلاً وہ چمار یا خاکروب یا کمہار ہے۔ ان کاموں کی ضرورت مستقل ہے اور ان کو تہذیب کا مخالف یا اس سے بے تعلق سمجھنا ہمارے نظریۂ تہذیب کی رو سے کسی طرح جائز نہیں۔ بے شک یہ نقطۂ نظر تہذیب کے قدیم اور مستند مفہوم کے بالکل خلاف ہے لیکن موجودہ اخلاقی اور فلسفیانہ تحریکات اور بہترین قدیم تعلیمات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محنت مزدوری اور تہذیب میں کوئی لازمی تناقض نہیں۔ گذشتہ زمانوں میں اگرچہ لوگوں نے تہذیب کے مفہوم کو ان چند مشاغل تک محدود کر دیا تھا جن میں وہ اپنے ذاتی شوقوں مثلاً علم کی تحصیل، عبادت

گزاری، فنونِ لطیفہ کی تخلیق و تحسین کی تشفی کرتے تھے اور اس کو دنیاوی مکروہات اور عملی زندگی کی کش مکش سے گریز کرنے کے لیے ایک پناہ سمجھتے تھے لیکن تہذیب کا یہ مفہوم نہایت سطحی، نہایت ناقص اور اوچھا ہے۔ اس میں زندگی کا جوشیلا خون بالکل نہیں ہے۔ یہ ایک قسم کی دماغی اور روحانی خود غرضی کا مرادف ہے اور اصلیت کے بجائے بیرونی جلا اور نمایش پر زور دیتا ہے۔ اس مفہوم کی روسے تہذیب کا سرچشمہ کتابیں اور درسی علوم ہیں۔ اور اس کا مقصد ہے تنہائی میں انفرادی قوتوں کی تربیت کرنا۔ لیکن ہم تہذیب کو بے کار یا باکار معلومات کا مجموعہ ماننے کے لیے تیار نہیں اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو شخص مخزنِ علوم ہو وہ مہذب انسان بھی ہو۔ بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ وہ تہذیب سے بے بہرہ رہے گا کیوں کہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوگی یا کتابیں نہ کہ انسانی زندگی اور اس کے وہ تلخ و شیریں تجربات جن کی چاشنی چکھنے کے بعد آدمی انسان بنتا ہے۔ ہمیں بارہا ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو باوجود عالم باعمل ہونے کے تہذیب سے محروم ہوتے ہیں۔ پروفیسر اشپرانگر نے اپنے نظریۂ نفسیات میں انسانوں کی جو قسمیں قرار دی ہیں ان میں ایک قسم Derakademische Mensch یعنی نظری انسان کی بھی ہے۔ جو تلاشِ حق اور طلبِ علم کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتا ہے اور اس میں بالکل محو اور فنا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی قابلِ قدر ہے اور اپنے نتیجۂ کار کی رو سے خدمتِ خلق کر رہا ہے لیکن بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے اگر اس کو اپنے گرد و پیش کے انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو، اگر وہ ان کے دکھ درد اور مشاغل میں شریک

نہ ہو، علاوہ علمی معاملات کے اور تمام معاملات کی طرف سے بے اعتنائی کرے، اس کی قوتِ عمل معطل ہو جائے، وہ انسانی جذبات کا احترام نہ کرے تو ہم اس کو بحیثیت انسان کے بہت ناقص اور تہذیب سے عاری سمجھیں گے۔ تہذیب کا جدید نظریہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد کام اور خدمت اور عملی تجربے پر رکھنی چاہیے نہ کہ کتاب اور نظری علوم پر۔ وہ تہذیب جو افراد میں حقیقی شرافت اور انسانیت کی روح پیدا کرتی ہے، محض مطالعہ عبادت گزاری یا آرٹ میں انہماک کا نتیجہ نہیں بلکہ خدمت خلق سے، محبت سے، دوسرے انسانوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرنے، ان کے جذبات و خیالات کو سمجھنے، ان سے ہمدردی اور محبت کرنے اور اس میں شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تجربات دل کو نرم اور دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ کارلائل کا یہ مشہور قول ہے کہ "کام عبادت ہے ہر کام جو خلوص سے کیا جائے برکت کا باعث ہے۔ جس شخص کو یہ برکت نصیب ہے اسے اور کوئی برکت طلب کرنے کی ضرورت نہیں"۔ خدمت بشرطیکہ وہ خلوص اور دانشمندی کے ساتھ کی جائے، رحم کی صفت کی طرح "دو چند متبرک ہے"۔ وہ اس کے لیے بھی برکت ہے جو خدمت کرے اور اس کے لیے بھی جس کی خدمت کی جائے۔ اس خدمت کے طفیل عملی کام کرنے والوں میں وہ برتری کا احساس پیدا ہونے نہیں پاتا جو انھیں محنت مزدوری کرنے والوں سے جدا رکھتا ہے اور بیشمار معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے ہر وہ تحریک جو "تحریکِ خاکساران" کی طرح لوگوں میں محنت اور خدمت کے شوق اور صلاحیت کو بڑھائے، تہذیب کی اشاعت میں براہِ راست مدد دیتی ہے۔

لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ رواداری کا ایک غلط مفہوم وہ بھی ہے جو آج کل رائج ہو گیا ہے اور جو اس کو تقریباً بے اعتنائی کا مرادف قرار دیتا ہے۔ تعلیم یافتہ گروہ میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جس کے نزدیک کسی اصول یا عقیدے کی کوئی اہمیت نہیں۔ نہ تو خود اس کے کوئی پختہ اصول ہیں نہ وہ دوسروں کے اصولوں کی قدر کرتا ہے بلکہ وہ ان کے اصول اور عقائد پر اختلاف یا جھگڑا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سب برابر ہیں۔ اس لیے وہ سب کی طرف سے یکساں بے پروائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ہم اپنے ابنائے جنس پر محتسب بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ہم اپنے بھائیوں کے رکھوالے نہیں ہیں!" چنانچہ جن امور کے متعلق اربابِ فکر شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں، مثلاً یہ "خدا ہے یا نہیں، سیاست میں فلاں مسلک صحیح ہے یا کوئی اور، اچھوتوں کے حقوق دیے جائیں یا نہیں۔ عورتوں کا نظامِ معاشرت میں کیا مرتبہ ہے، انسان کی زندگی کا مقصد جلبِ منفعت ہے یا خدمتِ خلق"، ان سب مسائل کی اس کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنے خیال کے مطابق بسر کرنی چاہیے۔ دوسروں سے بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہیں۔ لیکن یہ حقیقی رواداری نہیں۔ یہ ذہنی رویہ فلسفۂ تشکیک پر مبنی ہے جس کو بعض مفکرین نے بہت وقعت دی ہے مگر اس کو عقلی آزادی اور آزاد خیالی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اس رویّے کے اصلی معنی یہ ہیں کہ اس نام نہاد تشکک نے کوئی خاص نظام اقدار، کوئی معیارِ زندگی قائم نہیں کیا۔ اس کی زندگی خاص مقصد کے

ساتھ وابستہ نہیں۔ ہم جس رواداری کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں۔ اس کے لیے صرف یہی شرط ہے کہ وہ عقائد ہماری ذہنی آزادی اور غور و فکر کو معطل نہ کریں۔ اس شرط کے ساتھ عقائد کی پختگی تشکیل و تنظیم حیات کے لیے لازم ہے۔ سچی رواداری کی تعریف یہ ہے کہ ہم زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے اپنے مخصوص خیالات اور عقائد رکھتے ہیں اور خلوص کے ساتھ ان پر کاربند ہیں لیکن عقلاً اور عملاً دوسروں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مختلف خیالات اور عقائد رکھتے ہوں۔ ہم اپنی رائے کو جوش اور عقیدت کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں، انھیں اپنا ہم رائے بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم خندہ پیشانی اور بردباری کے ساتھ ان کی بالکل مخالف رائے کو سننے اور اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہیں اور اس اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں تلخی اور ناگواری پیدا نہیں ہوتی۔ اس ذہنیت کی تربیت کے لیے یہ لازم ہے کہ ہم افراد میں تجسس کا مادہ اور شوق کی وہ زندگی اور بیداری قائم رکھیں جو بچپن کا خاصہ ہے لیکن ناسازگار ماحول کی وجہ سے ابتدائی عمر میں دب جاتا ہے اور لوگوں پر قبل از وقت کہولت طاری ہو جاتی ہے۔ جس طرح یہ بات تہذیب کے مطالبات کے خلاف ہے کہ ہم بہ جبر اپنے خیالات دوسروں پر عائد کریں، اسی طرح یہ بھی تہذیب کے منافی ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے خیالات اور عقائد کے بوجھ میں دب کر نئے خیالات اور نئے حقایق کا استقبال نہ کر سکیں۔ ہندستانیوں پر تو خاص کر کے

قبل از وقت کہولت طاری ہوجاتی ہے۔ دماغی عدّت اور جولانی کا مادہ باقی نہیں رہتا۔ جس طرح نوعمری کی شادیاں یا ملازمت جسمانی شباب کی موت ہے اسی طرح عقائد اور خیالات کا اس طرح جامد ہوجانا کہ انسان میں سوچنے اور غور کرنے کا مادّہ نہ رہے اور وہ ہر نئی بات سے گھبرائے ذہنی شباب کا خاتمہ ہے۔ ایمان اور عقیدے کی اہمیت تسلیم۔ لیکن انسان کو یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ آنکھوں پر اندھیریاں لگاکر زندگی بسر کرے۔ اسے تو شہیدِ جستجو ہونا چاہیے:

ہمہ سازِ ناتمامم ہمہ سوزِ آرزویم ؛ بگمان وہم یقیں را کہ شہیدِ جستجویم

ہم نے تہذیب کا جو مفہوم مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کے ضمن میں ایک دل چسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک پُرجوش اور سرگرم مجاہد تہذیب یافتہ ہوسکتا ہے یا نہیں۔ مجاہد سے یہاں ہماری مراد وہ شخص ہے جو کسی خاص مقصد کی حمایت یا تحصیل میں اس درجہ منہمک ہوجائے کہ اس کے لیے اور تمام چیزوں کو قربان کرنے کو تیار ہو اور اسے اس انہماک میں اتنا غلو ہو کہ وہ اور تمام مفاد اور اغراض کو نظر انداز کردے۔ اس ذیل میں صرف جنگ جو سپاہی ہی شامل نہیں بلکہ وہ تمام لوگ بھی شامل ہیں جو کسی نیک اور مفید کام میں مثلاً علم کی تحصیل یا مذہب کی اشاعت اور حمایت یا سیاسی مقاصد کے لیے اپنا تن من دھن نثار کردیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ یقیناً قابلِ احترام ہیں اور دنیا میں اکثر بڑے بڑے کاموں کو ایسے ہی لوگوں نے انجام دیا ہے جن کو کسی ایک خیال کی دُھن ہوجاتی ہے۔ کسی ایک چیز سے اس درجہ شغف ہوجانا کہ وہ جنون کی

حد تک پہنچ جائے کامیابی کے لیے اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔ مجاہد کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جن کا ہم اعتراف کرتے ہیں اور تہذیب کا لازم جزو سمجھتے ہیں۔ اس عقیدے کی پختگی ہوتی ہے، جب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک معاملے میں حق پر ہے تو وہ اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے لیے ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ ہم اس کے ایثار اور یک جہتی کی قدر کرتے ہیں۔ اس کے لیے اعلا جرارت درکار ہے جس میں جسمانی، دماغی اور اخلاقی جرارت تینوں شامل ہیں۔ اس کو تکلیفوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اکثر سوسائٹی کی ناپسندیدگی اپنے سر لینی پڑتی ہے لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے جو آدمی بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ جسمانی تکلیف یا معاشرتی مخالفت یا ذہنی تنہائی کے خوف سے اپنے مستحکم عقیدوں کو ترک کر دیتا ہے۔ اس شخص میں تہذیب کی صفات پیدا ہونی مشکل ہیں، لہٰذا جرارت کو ہم تہذیب کے لیے ایک شرطِ لازم قرار دیتے ہیں بشرطیکہ اس شخص میں اخلاقی جرارت کی یہ شان بھی ہو کہ جب انسان اپنی کوئی غلطی محسوس کرے یا دوسرا اس کو محسوس کرائے تو وہ بے کم و کاست اپنی غلطی کا اقرار کر لے اور جھوٹی شرم سے مغلوب نہ ہو جائے۔ یہ جرارت کی سب سے اعلا شکل ہے جو گویا انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف دکھانی پڑتی ہے۔ اس کے لیے بڑے دل اور جگر کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اکثر لوگ عزتِ نفس کا ایک غلط مفہوم اپنے ذہن میں قائم کر کے اس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے

ہٹنے یا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو کسرِ شان سمجھتے ہیں خصوصاً اُن لوگوں کے لیے یہ بات بہت مشکل ہے جن کو عام طور پر بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے اور جن کے تمام حرکات اور افعال عوام کی نظر میں رہتے ہیں۔ بہر حال اس جرارت کو اپنے میں پیدا کرنا، ہر کام کو جوش، خلوص اور انہماک کے ساتھ انجام دینا، مشکلات کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا مجاہد کی صفات ہیں اور ان کی ہمیں دل سے عزت کرنی چاہیے۔

لیکن یہ مجاہدانہ صفات بجائے خود ایک شخص کو ہمارے خیال میں مہذب نہیں بنا سکتیں۔ تہذیب کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایک ہمہ گیر نظر ڈال سکے۔ اس کی طبیعت میں توازن ہو۔ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ اس کے تمام رُخوں پر غور کرنے اور متعلقہ اشخاص اور واقعات کو جانچنے کے لیے کوئی طریقۂ عمل اختیار کرے۔ حقوق اور مطالبات کے اسی توازن کو مذہب اور فلسفے نے عدل کے نام سے تعبیر کیا ہے 'اعدلوا ھو اقرب للتقوی'۔ مجاہد اکثر معاملے کا ایک ہی رُخ دیکھتا ہے اور یہ وہ رُخ ہوتا ہے جس سے اس کو بہت گہری ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظر کی یک جہتی سے اس کی قوتِ عمل دوچند بلکہ چہار چند ہو جاتی ہے لیکن وہ عقلِ سلیم سے کام نہیں لیتا اور انجام کار نقصان اُٹھاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں اپنے تجربے میں اکثر ملتی رہتی ہیں۔ علم کے مجاہد کا ذکر اوپر آچکا ہے جو طلبِ علم میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ انسانی حقوق کی اس کو شناخت نہیں رہتی اور وہ اپنے معاشرتی فرایض کو ادا نہیں

کرتا۔ اسی طرح بعض مذہبی مجاہد ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کی تبلیغ اور ان کی حمایت میں اس قدر منہمک ہوجاتے ہیں کہ ان میں احساسِ تناسب باقی نہیں رہتا۔ وہ ہر ہر نقطے اور شوشے کی غلطی کو کفر کا مترادف سمجھتے ہیں، کسی قسم کے اختلاف کے روادار نہیں ہوتے۔ جو جو شخص ان سے اختلاف کرتا ہے اسے عذابِ ابدی کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کی بے حرمتی اور دل آزاری کرتے ہیں اور اسی کو باعثِ ثواب سمجھتے ہیں۔ ان میں محبت، ہمدردی اور رواداری کے سوتے خشک ہوجاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں بہت سے لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہوں لیکن اس قدر غلو اور تعصب اور آنکھوں کو بند کرلینا نہ صرف تہذیب اور انسانیت کے منافی ہے بلکہ روحِ مذہب کے بھی خلاف ہے۔ بے شک حق پرست ہونا بہت اچھا ہے، اس کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ اس کے لیے ایثار اور قربانی کرنا بہت بڑی قابلِ تعریف بات ہے۔ لیکن انسان کے دل میں جو خطا اور نسیاں کا پتلا ہے، کبھی یہ خیال بھی تو آئے کہ ممکن ہے کہ وہ غلطی پر ہو یا اگر غلطی پر نہیں تو ممکن ہے کہ وہ بھی راستی پر ہو اور دوسرے لوگ بھی۔ کیوں کہ خدا کی وسیع خدائی میں اکثر ایک ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے ایک سے زیادہ راستے ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مکمل تہذیب یافتہ انسان میں مجاہد کا سا عزم اور حوصلہ اور جرارت اور ایثار اور قوتِ عمل ہو۔ وہ اپنے مشاغل اور فرائض کو جوش اور انہماک کے ساتھ انجام دے۔ لیکن

اپنے احساسِ تناسب اور اپنے توازن کو قائم رکھے اور عقل اور جذبات کے تقاضوں کو عمل کی یورش میں نظر انداز نہ کرے۔ کسی ایک خیال کی اوٹ میں تمام دنیا اس کی نظر سے اوجھل نہ ہوجائے۔ مجاہدوں کے لیے بہتر مثال تاریخ کے مجاہدِ اعظم امام حسین علیہ السلام کی ہے جنھوں نے باوجود اپنے شوقِ شہادت کے، باوجود راہِ خدا میں سرفروشی کرنے کے، باوجود انتہائی مظالم اور تکالیف برداشت کرنے کے حقوق العباد کو بھی کما حقہٗ ادا کیا اور عدل و تہذیب اور انسانیت کی ایک ایسی مثال قائم کردی جو ہمیشہ دنیا کے لیے شمعِ ہدایت بنی رہے گی۔

یونان قدیم کے مفکرین نے ان صفات کو جو تہذیب کے کمال کے لیے لازمی ہیں ایک لفظ Shoprosyne سے ادا کیا ہے۔ اس لفظ کی بالکل ٹھیک تشریح کرنی مشکل ہے۔ "اعتدال" اس کا جزو ضرور ہے لیکن اس صفت کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا۔ "حیا اور خاکساری" جس حد تک بے جا تہور اور ادعائے خودی اور خود نمائی کو روکتی ہے اس میں شامل ہیں۔ لیکن اس کے مکمل مفہوم پر محیط نہیں۔ یہ سکون سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگرچہ سکون اس کا ایک جزو ضرور ہے۔ اس میں بے نفسی بھی شامل ہے اور ایک ایسا معیار اقدار بھی جو گھٹیا درجے کی خوشیوں اور فائدوں کو حقیر سمجھے۔ اس میں اعتدال اور ضبطِ نفس کی جو شان مضمر ہے وہ کسی بیرونی جبر یا دباؤ سے پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ آزادی اور اس کے صحیح استعمال کا ثمر ہوتی ہے۔ سر آرتھر کوئلر کوچ نے اپنے ایک لکچر میں اس کا ترجمہ Assured Mentalgrace کیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ جس شخص میں یہ صفت ہوتی ہے وہ

اپنی قابلیت کے حدود سے واقف ہوتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہر قسم کے لوگوں سے مل کر بنتی ہے۔ اس کو اپنی جگہ پر خاموشی اور اطمینان کے ساتھ اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی علمی تربیت کی بدولت ہر علم دوست حلقے میں شریک ہو کر مستفید ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہ وہاں سے گھر جاتا ہے تو وہ عقل مند ترین لوگوں کو بھی فیصلے کے لیے اپنے ضمیر کے سامنے پیش کرتا ہے کیوں کہ اس کا ضمیر اور اس کے دل و دماغ اپنے ہیں جن میں صلاحیت ہے اور سمجھ ہے اور وہ جانتا ہے کہ خواہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کتنی ہی کسرِ نفسی کے ساتھ جانچے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے معاملات کو خود سمجھے اور اس پر غور کرے۔ اس بیان سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ تہذیب کے مفہوم میں ہمہ گیری، سکون اور عزتِ نفس بھی شامل ہیں اور ہر قسم کا اوچھاپن، جھوٹی شیخی اور جھوٹی کسرِ نفسی تہذیبِ حقیقی کے منافی ہیں۔ اس مفہوم کی عملی اور شخصی مثال حالی کی لاثانی اور غیر فانی مرثیۂ غالب میں مل سکتی ہے:

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلّف اور اس کی سیدھی بات

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

تہذیب یافتہ انسان کی ایک اور امتیازی صفت یہ ہے کہ اس کے لیے ہر نیا تجربہ علم و حکمت کا ایک خزانہ ہوتا ہے جس سے اس کی دانش مندی، اس کی بردباری، اس کی انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے اس کے لیے تجربات کی مثال ایسی نہیں جیسے کسی فائل میں بہت سے کاغذات شامل کر دیے جائیں بلکہ وہ اس کی وسعت پذیر شخصیت میں زیادہ گہرائی اور معنویت پیدا کرتے ہیں۔ وہ ناگوار تجربات پر بھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتا۔ نظامِ عالم اور خالقِ عالم کو الزام نہیں دیتا بلکہ ان سے بھی سبق اور استحکام حاصل کرتا ہے۔ اس کے لیے دُکھ، سُکھ سے زیادہ سبق آموز بن جاتا ہے۔ کیوں کہ مصیبت اور رنج کی آزمایش میں سے نکل کر اس کی طبیعت میں زیادہ نرمی، زیادہ

ہمدردی اور زیادہ سمجھ پیدا ہو جاتی ہے:

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اس لیے انسان کی تہذیب اور تربیت میں ہر تجربہ خواہ وہ ناگوار ہو یا خوش گوار معین ہوتا ہے۔ مرغ اور ہُدہُد کے قصے میں جس کو اقبال نے نظم کیا ہے اسی طرف اشارا ہے:

مُرغے ز آشیانے بہ سیرِ چمن پرید
خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید

بدگفت فطرتِ چمن روزگار را
ہم سوز خود وہم زعم دیگراں تپید

گفت اندریں سرا کہ نباید فتادہ کج
صبحے کجا کہ چرخ درو شامہا نچید

یہ مُرغ تہذیب سے عاری تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دکھ درد مصیبت کو کس طرح معین کار بنایا جا سکتا ہے۔ ایک تجربہ کار اور رمز شناس ہُدہُد نے اس آہ وزاری کو سُن کر اس پر رحم کھایا اور کانٹے کو نکال دیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ زرّین نصیحت بھی کی جو غور کے قابل ہے:

گفتا کہ سودِ خویش زجیب زیاں بیار
گل از شگاف سینہ زرِ ناف آفرید

درماں ز دردساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خارِ شو کہ سراپا چمن شوی

عام لوگوں کی زندگی تو ذرا سی آزمایشوں اور تکلیفوں سے تلخ اور بے کیف ہو جاتی ہے لیکن وہ اہلِ دل اور اہلِ نظر جن کو قدرت کی طرف سے نفسِ مطمئنہ ملا ہے اور جنھوں نے اصلی تہذیب کو حاصل کیا ہے انھیں تجربات کی بنا پر بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک مکان یا زمین کی طرح کسی شخص کی ملکیت ہو سکے۔ وہ تو ایک خاص انداز سے زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ جس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے تمام تجربوں کی مسلسل تنظیم و تشکیل کرتا رہے اور ان کی مدد سے پرانی چیزوں سے بھی نیا لطف اور کیف حاصل کرے۔ بقول امریکہ کے معلّم اعظم ڈیوی (Dewy) کے تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں یہ صلاحیت ہمیشہ بڑھتی رہے کہ وہ ہر چیز سے زیادہ وسیع اور گہرے معانی حاصل کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک تہذیب یافتہ شخص جس کے ذوقِ جمال کی تربیت ہوئی ہے تاج محل کو دیکھتا ہے تو اسے اس عمارت میں ایک ایسا حُسن دکھائی دیتا ہے جو ایک ناواقف بچے یا ایک جاہل بالغ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ یہی حالت ہر قسم کی تحسین اور لطف اندوزی کی ہے۔ تہذیب خود انسان کی ذات اور اس کے مذاق میں ایسی معنویت پیدا کر دیتی ہے کہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کو معمولی نظر آتی ہیں اس کے لیے سرمایۂ مسرت و تحسین ہوتی ہیں۔ ورڈس ورتھ کا قول ہے کہ ہرے بھرے جنگل کی ہوا کا ایک جھونکا ہمیں انسان اور خیر و شر کے متعلق وہ باتیں سکھاتا ہے جو دُنیا کے تمام دانش مند مل کر بھی نہیں بتا سکتے۔ لیکن اس جھونکے کے

پیغام کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لیے صاحبِ دل اور صاحبِ نظر ہونا شرط ہے۔ اسی لیے سعدی نے اپنے شعر میں "نظر ہوشیار" کی شرط لگا دی:

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

لیکن جس طرح یہ تہذیب یافتہ انسان ایک طرف معمولی چیزوں میں معنویت اور دل آویزی ڈھونڈ نکالتا ہے، اسی طرح وہ معیار اقدار کی رو سے بہت سی ان چیزوں کو حقیر سمجھتا ہے جو عوام النّاس کے لیے بہت وقیع ہیں اور جن کے لیے وہ تمام عمر جدوجہد کرتے ہیں اور حق تلفی اور ظلم کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً دولت، شہرت، اعزاز و خطابات۔ وہ ان کے لیے اپنا سکونِ قلب اور قناعت کھونے کو تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ لوگوں کی مجنونانہ جدوجہد پر ہنستا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ دنیاوی قوت اور عزّت کے لیے ایک حد تک جدوجہد کرے کیوں کہ ہم تہذیب کو ترکِ دنیا کا مرادف نہیں سمجھتے لیکن وہ اس کش مکش میں ہرگز اس درجہ منہمک نہیں ہوتا کہ اپنے احساس اور تناسب اور ذوقِ ظرافت کو کھو بیٹھے اور جن چیزوں کی حیثیت محض ذرائع کی ہے ان کو مقصدِ زندگی بنا لے۔

آخر میں ہمیں اس مسئلے سے بحث کرنی چاہیے کہ ہمارے نقطۂ خیال کے مطابق مقصدِ حیات کیا ہے اور ہمارے نزدیک تہذیب یافتہ انسان کا رویّہ اس بارے میں کیا ہونا چاہیے۔ جن لوگوں کی تمامتر اُمیدیں اسی دُنیا کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کا

خیال ہے کہ چراغِ حیات گُل ہو جانے سے انسان کی روح اور شعور احساس بھی فنا ہو جاتے ہیں، ان کا تو اعتقاد لازماً یہی ہونا چاہیے کہ مدّتِ حیات کو غنیمت جان کر انسان کو جو کچھ لینا، حاصل کرنا، اپنے قبضے اور تصرف میں لانا ہے اس کو لے لے۔ اس لحاظ سے انسان کا فرض اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دُنیا کی جس قدر نعمتوں پر قبضہ کر سکے کرلے اور کنجوسوں کی طرح جب تک ممکن ہو ان پر قبضہ کیے بیٹھا رہے اور ان کو صرف نہ کرے۔ زندگی کے اس نظریے کی مختلف مثالیں ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ معاشی زندگی میں سرمایہ داری کا نظام، سیاست میں ملک گیری اور اقلیم رانی کی ہوس، معاشی تعلقات میں تنگ نظری اور خود غرضی یہ سب اسی مفروضے پر قائم ہیں کہ انسان بالطبع خود غرض ہے۔ وہ لینا چاہتا ہے، ذخیرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کو دینا اور خرچ کرنا ناگوار ہوتا ہے۔ ملکیت اس کی جبلّت ہے۔ خدمت اس کی فطرت کا جزو نہیں۔ اس کے برخلاف دوسرا نظریۂ زندگی وہ ہے جو بہترین انسانوں کا ہمیشہ رہا ہے۔ اس کی رو سے زندگی امانتِ الٰہی ہے جس کو خدا کی راہ میں فیاضی کے ساتھ بسر کرنا چاہیے۔ انسان کو مختلف قوتیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ انھیں اعلا انسانی مقاصد کی خدمت میں صرف کرے۔ یہ نظریہ نفس پرستی اور عیش پسندی کے بجائے خدمت اور ایثار کی تعلیم دیتا ہے اور لوگوں کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی تمام قوتوں کو ایک کنجوس دولت مند کی طرح

مقفل کر کے نہ رکھیں بلکہ ان کو بے دریغ رفاہِ عام کے لیے صرف کریں۔ کیوں کہ جس طرح علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے، اسی طرح انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو خدمت کے ذریعے اور زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنے نفس کو خدا کی راہ میں بیچ ڈالتے ہیں وہی اس کی اصلی قیمت حاصل کرتے ہیں۔ کیوں کہ بقول حضرت عیسیٰؑ کے "وہی شخص اپنی روح کو پائے گا جو اُسے کھو دینے کے لیے تیار ہو"۔ اس لحاظ سے اسلامی تعلیم قدیم اور جدید مغربی تعلیم اور فلسفے پر بہت نمایاں فوقیت رکھتی ہے۔ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے "عصرِ جدید" میں ایک مضمون "تعلیم کی ظاہری غرض اور انتہائی مقصد" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں انھوں نے اس امر سے بحث کی تھی کہ مقصدِ حیات اور تعلیمی نصب العین کے بارے میں مغربی اور اسلامی نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے؟ "جدید تعلیم یا مغربی فلسفہ قرار دیتا ہے کہ اعلا خود غرضی اخلاق کی بنیاد ہے۔ اعلا خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ دور اندیش اپنی غرض اور مصلحت کو سمجھے۔ یہ نہیں کہ جس بات سے آج آرام و آسایش معلوم ہوتی ہے اور کل کو اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے اس سے ضرر ہو، اس کو انسان اچھا سمجھ کر کرنے لگے۔ یہ تو ادنا غرض ہے۔ اسلامی تعلیم یہ کہتی ہے کہ شخصی اور نوعی غرض بالکل جائز اور بجا ہے مگر وہ ادنا درجے کی ہے۔ اصلی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ ذاتی خواہشوں پر مشیتِ ایزدی اور قوانینِ کل کے تابع کر دے۔" یا ایھا الذین آمنو!

انفقوا مما رزقنا کم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ ٥"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنی کل قوتوں اور دولت کو یہاں خرچ کرے کہ یہ زندگی اسے اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اپنے عمل، سعی اور ایثار سے حیاتِ ابدی حاصل کرے۔ جو لوگ اس اصول کو نہیں سمجھتے اور خدا کی دی ہوئی قوتوں اور نعمتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے، وہ کافر یعنی ناشکرے اور ظالم ہیں اور تاریکی میں ہیں۔ جدید تعلیم سکھاتی ہے کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ کیوں کہ کل تم مر جاؤ گے۔

نوروز و نو بہار و مے و دلبرِ خوش است
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ کھاؤ پیو مگر حالتِ اعتدال سے نہ نکلو کیونکہ بے اعتدالی اور بے جا کام انسانیت کی موت ہے"۔۔۔۔۔
(عصر جدید جلد ۹) ہم نے جس تہذیب کی تعریف اور تشریح اس مضمون میں کی ہے وہ قطعی طور پر تنگ نظری، خود غرضی اور خود پسندی کے منافی ہے اور انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بہترین اور بلند ترین مقاصدِ انسانی کے لیے صرف کرے اور ان کی تحصیل کے لیے مزدوروں کی طرح کام کرے۔ ہم تہذیب کو عیش نصیب اور فرصت پسند لوگوں کا مشغلۂ تفریح بنانے کے لیے تیار نہیں۔ ہمیں ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو عقلِ سلیم اور سلامت روی

کے ساتھ اپنے تمام حقوق و فرائض پر ہمہ گیر نظر ڈال سکیں اور ان کو خلوص اور انہماک کے ساتھ پورا کریں۔

میں اس مضمون کو ختم کر کے اس پر نظر ڈالتا ہوں تو میرے دل میں دو مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں نے تہذیبِ نفس کے لیے جن صفات کو لازم قرار دیا ہے وہ سب متفق علیہ ہیں۔ میں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جس پر کسی قدامت پسند شخص کو بھی اعتراض ہو۔ رواداری، عدل، ذہنی آزادی، دلچسپیوں کی بیداری، زندگی کو امانتِ الٰہی سمجھنا، کام کو خدا کی نعمت خیال کرنا، اس کو عار نہ سمجھنا، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کو کم از کم نظری طور پر ہر زمانے میں لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب کے مروجہ مفہوم کا کماحقہٗ احترام نہیں کیا۔ میں نے تہذیب یافتہ لوگوں کی شان میں بہت گستاخیاں کی ہیں۔ ان سے کام اور محنت کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کے احساسِ خودی کو ٹھیس لگائی ہے اور انھیں ان کے مقامِ علیین سے اُتار کر معمولی جاہل اور ناشائستہ مزدوروں اور کسانوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ ان کے دل میں یہ شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بالکل معصوم اور بے خطا نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے کہ وہ کسی معاملے میں غلطی پر ہوں۔ میں نے فنونِ لطیفہ، علمیت، مذہبیت اور شایستگی پر زیادہ زور دینے کے بجائے انسانیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تمام بیان سے تہذیب یافتہ انسان کی جو تصویر مرتب ہوتی ہے وہ اتنی دل کش اور نظر فریب ہے

یا نہیں جیسی اس کی روایتی تصویر. لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ تہذیب کا یہ مفہوم زیادہ مفید، زیادہ پائدار اور زیادہ عملی ہے. اس کے لیے یہ شرط نہیں کہ انسان خاص طور پر خوش نصیب ہو اور اس کے حالات غیر معمولی ہوں بلکہ اس تہذیب کی شان ہر وہ شخص اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے جو خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر آمادہ ہو۔




خوشنویس: ایس، ایم، مظہر